خدابخش لائبریری

جرنل

۴۶



خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدا بخش لائبریری

تماہی

جرنل

پٹنہ

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 52224
Date 8-9-88



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۳۴۲/۷۷ | قیمت فی شمارہ : پچیس رُپے
شمارہ : چھیالیسواں | سالانہ : ۱۰۰ رُپے (ہند)
قیمت : پچیس رپے | ۲۰ ڈالر (ایشیا)، ۴۰ ڈالر (دیگر ممالک)

فہرست

رقعات رشید صدیقی	پروفیسر مسعود حسین	۱
حیدرآباد اور اردو لغت	جناب حسن الدین احمد	۳۱۵
یونس امرہ: ترکی کے سب سے پہلے صوفی شاعر	ڈاکٹر ایرکان ترکمان	۳۲۷
ایک نادر جنتری	جناب سید شاہ محمد اسمٰعیل	۳۳۳
تبصرہ: اردو دانشز فیشنل (کناڈا)	ادارہ	۳۳۵
اقبال ریویو / اقبالیات (لاہور)	"	۳۳۹

انگریزی حصہ:

خدا بخش توسیعی خطبہ: اسلام کے معاشی نظام کا تصور	پروفیسر جمال خواجہ	۱ — ۳۸

۱۹۸۸ء

محبوب حسین صاحب نے پنچ سلیتھو پریس، رعنا لین، ایچ۔ ۳، اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔

—— ایڈیٹر: عابد رضا بیدار

رقعاتِ رشید صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خطوط پروفیسر مسعود حسین کے نام

مرتبہ

پروفیسر مسعود حسین
علی گڑھ

● ڈاکٹر مسعود حسین۔ (پ ۱۹۱۸ء) : مشہور ماہر لسانیات پروفیسر رشید احمد صدیقی کے شاگرد خاص اور ان کے رفیق کار۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں پروفیسر ایمیریٹس کے عہدے پر فائز کیا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارے ۱۹، ۳۷۔ ۳۹ ملاحظہ ہوں۔

●●

طبع دوم کے بارے میں

(۱) طبع ثانی میں کتابت کی غلطیوں کی صحت کی گئی ہے۔

(۲) بعض مقامات پر اصل خطوط کو دوبارہ دیکھ کر متن میں جزوی (لفظی) اضافہ یا ترمیم بھی کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر لفظ نہیں پڑھے جا سکے تھے، کوشش کر کے انھیں پڑھا گیا ہے۔

(۳) بعض حواشی میں بھی اضافے اور ترمیمات کی گئی ہیں

(۴) پیش لفظ کی زبان کی نوک پلک جا بجا درست کی گئی ہے۔

(م - ح)

رشید صاحب! چند یادیں

میں شاگردِ رشید ہوں۔ یہ کلمہ توصیفی نہیں کلمہ اضافی ہے۔ اس کو کلمہ توصیفی کہنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ یہ اختیار تو رشید صاحب کو تھا یا دیگر اہلِ نظر کا ہے۔

۱۹۳۹ء میں رشید صاحب کی شاگردی کے رشتے میں منسلک ہونے سے بہت پہلے میں اُن کے بارے میں پڑھ اور سُن چکا تھا۔ ایک تو ان کا میرے عمِ بزرگوار ڈاکٹر ذاکر حسین سے خصوصی تعلق، دوسرے اُن کے چٹ پٹے فقرے اور بلیغ مطائبات جو میرے گھرانے میں در آئے تھے ان سے ایک غائبانہ قرب کا باعث بن چکے تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۹ء میں جب میں سابق اینگلو عربک کالج دہلی سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخلے کے لیے علی گڑھ پہنچا تو رشید صاحب سے پہلی مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ ان کے نئے تعمیر شدہ مکان کے مردانہ حصّے میں، کمرے سے باہر پھوس کے چھپر کے نیچے، بے کمر اور باکمر سرکنڈوں کے مونڈھوں پر۔ میرا ان کا پہلا سامنا غالب کے مشہور شعر "رو کے" اور "کھینچے" سے بخوبی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عرضِ حال سن لی اور بولے کل شعبۂ اُردو میں تشریف لائیے، اور اس کے ساتھ ملاقات یک لخت ختم کر دی

لوٹتے وقت ایسا محسوس ہوا نہ تماشا کامیاب آیا اور نہ تمنا بے قرار، داخلے کی حاجت مندی سوار تھی اس لیے دوسرے دن شعبۂ اُردو میں جا دھمکا۔ بغیر توجہ کیے انھوں نے میرے ہاتھ سے داخلہ کا فارم لے لیا اور آیئے حضرت کہہ کر میرے ساتھ ساتھ جا نکلے اسٹریچی ہال میں، جہاں ان دنوں داخلہ کا بازار لگتا تھا۔ کلرکوں سے لے کر پرووسٹ اور دیگر ارباب داخلہ تک، بے شمار میزیں یہاں اندراج کرایئے، یہاں ہال اور ہاسٹل کا انتخاب کیجیے، یہاں فیس داخلہ جمع کیجیے، ہر میز پر تختے کے تختے لگے ہوئے تھے، پیروکار عام طور پر سینیر طلبہ یا رشید صاحب جیسے بعض اساتذہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ رشید صاحب کا جس میز کی طرف رُخ ہوتا ہے پرے کا پرا ہٹ جاتا ہے، کلرک ہو کہ اسسٹنٹ رجسٹرار ایک ہلکی سی اٹھک بیٹھک لگاتا ہے اور اُن کے فقرے کی تاب نہ لا کر جھٹ ان سے فراغت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس دن رشید صاحب کے وار بھرپور پڑ رہے تھے اور شاید ہی کوئی مردہ دل ہو جو اس سودا اور ان کے غنچہ کے کام سے پہلوتہی کرنے کی ہمت کرتا ہو، نتیجے جو کام گھنٹوں میں ہونا تھا وہ منٹوں میں ہو گیا۔ اس درمیان میری طرف سے مسلسل تجاہلِ عارفانہ رہا۔ ایک دھچکا اور لگا جب آخر میں مجھے داخلہ کا فارم تھماتے ہوئے انھوں نے کہا لیجیے حضرت! باقی کام آپ کا ہے فیس وغیرہ داخل کیجیے اور شعبۂ تاریخ (میں نے پہلے ایم اے تاریخ میں داخلہ لیا تھا) کا رُخ کیجیے۔

میں نے تاریخ کے مضمون کا انتخاب کچھ تو اس وجہ سے کیا تھا کہ مرا بی۔اے۔ میں یہ اختیاری مضمون تھا اور کچھ اس سبب سے کہ مرے خاندان میں مورخین کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ داخلے کی تمام تر تگ و دو میں رشید صاحب نے مجھ سے

یہ سوال نہیں کیا کہ یہ مضمون میں نے کس لیے انتخاب کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے اُردو کی گوں کا نہ سمجھتے ہوں یا میری عاقبت انھیں عزیز ہو۔ ابھی میرے قدم شعبۂ تاریخ میں جمنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک مورخ ہی کے ورغلانے پر (میری مراد پروفیسر مجیب سے ہے جو ان دنوں علی گڑھ آنکلے تھے) اکھڑ گئے اور ہفتہ عشرہ کے اندر ہی تبدیلیِ مضمون کی درخواست لے کر سہما سہما شعبۂ اُردو میں صورت سوال کھڑا ہوا تھا۔ جب رشید صاحب سے میں نے اپنی "اِس" نیت کا تذکرہ کیا تو بولے "خوب! یہ میں نے کب کہا تھا کہ آپ مجھ پر نازل ہوں"۔ پھر ٹھوک بجا کر پوچھا "کیا بالکل طے کر لیا ہے؟" میں نے کہا جی ہاں ایک مورخ ہی کے کہنے پر" کہا "اچھا تو لائیے درخواست" اور ایک شانِ بے نیازی سے دستخط کر دیئے۔

لیجیے اب میں شعبۂ اُردو کا طالب علم بن گیا یعنی شاگردِ رشید! شعبۂ اُردو میں اس وقت کئی حضرات درس دیتے تھے، لیکن ایم۔ اے۔ کے درس کی ذمہ داری رشید صاحب اور سرور صاحب کے سر تھی۔

شعبۂ اُردو میں آجانے کے بعد بھی رشید صاحب مجھ سے اور میں ان سے عرصے تک قدرے فاصلے سے رہے ___ میں احتراماً اور وہ احتیاطاً۔

رشید صاحب ابتدا سے خواص پسند تھے۔ طالب علموں سے وہ اپنا رشتہ یا تو درس تک محدود رکھتے تھے یا چلتے چلاتے ایک آدھ فقرے تک۔ ان کی اس خواص اور خلوت پسندی کی وجہ سے اکثر حضرات کو شاکی پایا۔ ان کا مکان ان کا حصار تھا۔ اس کا احاطہ کچھ اس قسم کا تھا کہ ملنے والا یا تو مردانے دروازے

سے ٹکریں مار کر رہ جاتا یا زنانے دروازے پر چیخ کر چلا جاتا۔ ان کی رہائش کا کمرہ دونوں دروازوں سے اس قدر محفوظ فاصلے پر تھا کہ ان کے وفادار ملازم سکندر کے توسط کے بغیر آپ کی کوئی صدا یا پیغام ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اور سکندر نہ صرف وفادار تھا، تربیت یافتہ اور مردم شناس بھی تھا۔ وہ نہایت خوش اسلوبی سے حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کر دیتا تھا۔ بس یہیں سے سماجی رشتوں کی نزاکتیں پیدا ہوتی تھیں۔ جمیع خلائق کو معلوم تھا کہ رشید صاحب ہمہ وقت علی گڑھ اور اپنے مکان میں موجود رہتے ہیں اور یہ صرف سکندر کی سکندری ہے جو اس خضرِ ادب کو غائب اور حاضر بنائے رکھتی ہے۔ اتفاق سے مجھے اس قسم کی نزاکت سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ اس لیے کہ میں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں ان کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور چوں کہ ہمیشہ "باادب ہوشیار" کا انداز رکھا اس لیے باریابی بھی ہمیشہ حاصل رہی۔

باریابی کا یہ مقامِ تعبیر کا ادھورا نقش تھا جس کا زنانہ حصہ مکمل اور مردانہ نامکمل تھا۔ اس نامکمل حصہ کی تلافی ان کا شاندار وہ چھپر تھا جو سائبان اور مردانہ ڈرائنگ روم دونوں کا کام دیتا تھا اور جس کے زیرِ سایہ عظیم ادبی شخصیتیں آتیں، بیٹھتیں اور کبھی کبھی ٹھہرتی تھیں۔ خواجہ غلام السیدین مرحوم نے اس مکان کے بارے میں کتنا بلیغ جملہ کہا تھا کہ یہ اپنے مکین کی شخصیت سے کتنی گہری مناسبت رکھتا ہے۔ باہر سے ناہموار لیکن اندر سے باغ و بہار! رشید صاحب معاشرتی و جمالیاتی دونوں اعتبار سے بیرونِ خانہ سے زیادہ اندرونِ خانہ کی زیبائش کے قائل تھے۔ چنانچہ جب کہ مکان کے باہری حصہ میں خاک دھول اڑتی تھی اندر ایک لہلہاتا چمن اور سبزہ زار تھا اور پھولوں کی د

بھر بار کر پریاں قطار اندر قطار۔ قلم کے بعد صرف کھرپی کو یہ شرف حاصل
تھا کہ اُن کے دستِ مبارک میں دیکھی جاتی جس سے وہ کیاریوں میں قلم کاری کرتے
"بہ شوقِ فضول" (   ) ان کی صحت کی ضمانت اور طمانیتِ قلب
کا باعث تھا۔ ضمناً غیر کی نظروں سے محفوظ وہ پھولوں میں گم رہتے اور ناخواستہ
ملاقاتیوں کے لیے ان کے وفادار سکندر کا یہ مستقل عذرِ لنگ ؎

ہر چند کہیں کہ ہیں، نہیں ہیں!

پھولوں ہی کی نسبت سے انھیں جانوروں سے چڑ تھی، میں نے کبھی
ان کے مکان پر کوئی کتّا پلا ہوا نہیں دیکھا۔ انھیں سالانہ چوریاں گوارا
تھیں لیکن کتا پالنا منظور نہیں تھا۔ اکثر کہتے کہ انسان سے بہتر جانور ہوتا ہے
لیکن سب سے بہتر یہ خاموش پھول پودے ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے قیمتی تحفہ
گلاب کا پھول ہوتا اور سب سے بڑی مرحمت گلاب کی پود، جسے وہ دوسروں پر
اعتبار نہ کرتے ہوئے اپنے خاص مالی سے آپ کے مکان میں لگوا دیتے۔ لیکن
اس کے ساتھ قدرداں کی ضرورت تھی ورنہ مجھ جیسے ناہنجار گلاب کو گوبھی
بنا دیتے تھے۔ وہ اپنے مکان سے دید بازدید کے لیے بہت کم باہر نکلتے۔ میرے
یہاں جو کبھی کبھی چل کر اچانک آجاتے تھے تو یہی دیکھنے کہ میں نے ان کے
گلابوں کا کیا حشر بنا دیا ہے! ایک دن کہنے لگے میں دیکھنے نہیں صرف ان
کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔ دیکھ کر دکھ ہوگا۔

رشید صاحب کا طریقۂ درس منفرد اور نرالا تھا۔ مطالعہ کی طرح درس
کے میدان بھی مخصوص اور محدود تھے، یعنی بیشتر غالب اور اقبال یا جدید
شعرا میں حسرت، فانی، اصغر اور جگر۔ انھوں نے تمام شعرا کے بارے میں اپنے

انداز میں سوچا تھا۔ ان کی یہ سوچ ان کے بلیغ فقروں کی شکل اختیار کر لیتی تھی جن میں ندرت اور اپج ہوتی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی اور کی ٹکسال سے ڈھل کر نہیں نکلے ہیں۔ ہم لوگ اکثر آپس میں مختلف اساتذہ کے طریقۂ تدریس اور علمیت کا موازنہ کرتے اور عام طور پر یہ رائے قرار پاتی کہ علمِ کتابی رشید صاحب کا میدان نہ تھا۔ لیکن ایک تو رچے ہوئے ذوقِ ادب اور دوسرے خداداد طباعی کی وجہ سے ان کی تحسین شناسی دوسروں سے بالکل مختلف انداز کی ہوتی۔ سونے پر سہاگہ ان کا منفرد انداز بیان جو صرف تحریر تک محدود نہ تھا بلکہ ایک ایک فقرے سے جھلکتا تھا۔ جب کہ دوسرے اساتذہ کی تقریر یاد رہ جاتی ان کی یادگار بن جاتی۔

غالب رشید صاحب کے محبوب شاعر تھے۔ اقبال سے وہ مرعوب تھے۔ لیکن ان کے ادبی ذوق کی تربیت غالب کے زیرِ سایہ ہوئی تھی جس کا کلام ان کے منفرد اسلوب کا سب سے بڑا ماخذ تھا۔ اصغر اور جگر سے ان کا ذاتی تعلق تھا لیکن اصغر کی تراشیدہ شاعری کے وہ زیادہ قائل تھے۔ شعر سے شغف کے باوجود یہ عجیب و غریب بات تھی کہ انھیں شعر بالکل یاد نہیں رہتے تھے۔ وزن کا احساس بہت کمزور تھا۔ کبھی آدھے مصرعے سے آگے نہیں بڑھ پاتے اور ہر بار اہلِ حلقہ میں سے کسی کو شعر اٹھانا پڑتا یا بڑھ جاتے تو بحرِ ہزج میں ڈال کر بحرِ رمل چلے، کی سی صورت پیدا ہو جاتی۔ لیکن شعر کا مفہوم حیرت ناک طریقے پر ان کے ذہن میں محفوظ ہوتا تھا جس سے وہ انتہائی محظوظ ہوتے اور بے ساختہ اس شعر کے کچھ الفاظ ان کی نوکِ زبان پر آجاتے۔

غالب سے وہ متاثر تھے خود انھوں نے ایک ادبی نسل کو متاثر کیا ہے۔ ادب کا کوئی بانکا جس کا تعلق علی گڑھ سے رہا ہو ایسا نہیں نکلا جو شعوری

یا غیر شعوری طور پر ان کے اسلوب کی زد سے باہر رہ سکا ہو۔ جو رہا وہ محروم رہا یا لائقِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ لیکن ان کے اسلوب کی نقل بہت مشکل تھی ع نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب کی صورت ہر متعلقِ رشید کے پیشِ نظر رہی۔ ہاں تھوڑا تھوڑا آب و رنگ سب نے اُڑائے ع ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے۔

۱۹۴۱ء میں میں نے مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کی سند حاصل کی۔ بیروزگاری کے احساس کو کم کرنے کے لیے آبائی وطن جاکر ہندی اور سنسکرت میں گریز کیا۔ وہاں سے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت میں چلا گیا۔ پطرس بخاری ڈائرکٹر جنرل تھے انھوں نے انتخاب تو کرلیا لیکن چند ماہ بعد بولے بھئی "آپ ریڈیو ٹائپ" نہیں لگتے۔ ن۔م راشد اور میراجی نے اس کی تصدیق کی۔ مجھ پر بھی بہت جلد ہی انکشاف ہوا۔ چنانچہ چھ مہینے ریڈیو کی ملازمت کرنے کے بعد پھر علی گڑھ آکر درِ پیرِ مغاں کھٹکھٹایا۔ رشید صاحب اس بار خنداں نہیں، انگشت بدنداں تھے۔ کہنے لگے آپ کو کیا پڑی ہے کہ اچھی خاصی ملازمت چھوڑ کر پچاس روپے کے ریسرچ وظیفے پر آنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا زندگی میں مراجعت اور بازگشت کے وجوہ نہیں ہوتے۔ بس یہی اب ٹھانی ہے۔ کہنے لگے آجایئے اور کوئی دن یہ زندگانی بھی کرلیجیے۔ میں آگیا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد عارضی جگہ پر بحیثیت جونیر لکچر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اب رشید صاحب کا اور میرا ہمہ وقت کا ساتھ تھا۔

اس وقت شعبۂ اُردو کی ہیئت ترکیبی آج کل سے بالکل مختلف تھی۔ یہ سرسید ہال میں سابق لٹن لائبریری کے بازو والے تین متصل اور ایک غیر متصل

کمرے پر مشتمل تھا۔ سامنے کے رخ کا بڑا کمرہ اساتذہ کی بیٹھک تھا جس کے درمیان متوسط سائز کی ایک میز اور گھومتے ہوئے شلف پر حاضری کے رجسٹر رہتے۔ تین طرف دیوار سے لگی ہوئی آرام (میڈک) کرسیاں رہتیں۔ دروازہ کے قریب کی آرام کرسی رشید صاحب کے لیے مخصوص تھی باقی سب غیر محفوظ۔ کوئی شخص اگر اپنے حصۂ اسفل کو بلند رکھنے کا خواہش مند ہوتا تو وہ مرکزی میز کے ساتھ کی آفس کرسی پر متمکن ہو جاتا۔ رشید صاحب گوشہ نشین رہتے، جسے ان سے گفتگو کرنا ہوتی پاس کی خالی کرسی پر جا بیٹھتا۔ جب ہجوم شوق زیادہ ہوتا تو ان کی کرسی کے اردگرد ایک ہلالی دائرہ بن جاتا جس سے گھبرا کر کبھی کبھی وہ حاضری کا رجسٹر ہاتھ میں لے کر یک لخت اٹھ کھڑے ہوتے اور سیدھے مکان کا رُخ کرتے۔

رفقائے شعبہ کے ساتھ رشید صاحب کی ہم نفسی اور ہم سخنی باہمہ اور بے ہمہ قسم کی تھی۔ وہ فقروں اور مطائبات میں کھلتے تھے لیکن ان کے "عالم بسط" کے بارے میں یہ پتہ چلانا سخت دشوار تھا کہ کب یہ "عالم قبض" میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ مجمع کو بالکل انگیز نہیں کر سکتے تھے (اگر تاج پوش ہوتے تو دربارداری کے رسم سے بالکل ناآشنا رہتے) اشخاص کو بھی صرف اسی وقت تک انگیز کرتے تھے جب تک ان کا جی چاہتا تھا۔ مکان ہو یا شعبہ کسی بھی بھاری پیندے والے کو اچانک رخصت ہو جانے کا مشورہ دے دینا ان کے معمولات میں سے تھا۔ کم یابی کے ساتھ ان کا یہ معمول بھی بعض حضرات کے لیے تکلیف دہ رہا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ رشید صاحب کو اپنی کوتاہیوں کا علم نہ تھا۔ وہ اپنی کم سخنی، کم یابی، کم انگیزی اور اس سے پیدا شدہ بعض اوقات کی سماجی نزاکتوں

پر نفریں بھی کرتے رہتے۔ اس وقت خاص طور پر غالب کا یہ مصرع ورد زبان ہوتا ع

غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

ایسے موقع پر میں ہنس کر کہتا کہ "رشید صاحب! غالب نے ایک ہی مصرع تو خلافِ محاورہ کہا ہے وہ آپ پر کس طرح چسپاں ہو سکتا ہے"۔ پوچھتے کیونکر؟ میں کہتا "اس مصرع میں "اپنی اوقات" ہونا چاہیئے" کہتے "یہ تو آپ نے پھر لسانیات کی اوقات بڑھائی" بات جہاں کی تہاں رہ جاتی ان کا موڈ بدل جاتا۔

انسانوں، عزیزوں اور رفیقوں کو آنکنے کی رشید صاحب کے پاس صرف ایک کسوٹی تھی اور وہ ان کے ایک پسندیدہ لفظ "نامعقول" میں مضمر تھی، یہ ان کا تیر بھی تھا، نشتر بھی تھا اور تانکس بھی۔ "کوئی نامعقول میرے دسترخوان پر نہیں بیٹھے گا"۔ "..... ایسا نامعقول کہ دماغ میں ہر وقت جوتے لگتے رہتے ہیں" وہ اس ایک لفظ سے اپنے لیے انسانوں کے وجود کو ختم کر دیتے۔ نامعقول شاعر کی شاعری کے منکر ہو جاتے۔ "کوئی نامعقول انسان اچھا شاعر نہیں ہو سکتا" کلیات قائم کرتے اور خود اپنے گرد ایک حصار کھینچ لیتے۔ نامعقول اور نامعقولیت کے لیے ان کی تعزیرات میں کوئی معافی نہیں تھی۔

میرا رشید صاحب کی شخصیت کا مجموعی تاثر ایک شدید انفرادیت، داخلیت پسند اور حساس طبیعت رکھنے والے فنکار کا ہے۔ وہ غیر معمولی، غیر تعقلی ذہانت اور بصیرت کے مالک تھے۔ ایک مخصوص طبقے اور عہد کی اقدار اور وضع داریوں کو عزیز رکھتے تھے اور انھیں پیمانوں سے ان سب کو ناپتے جو ان کی رہگزر

حیات پر آنکلتے۔ وہ بُت شکن سے زیادہ خدا ساز تھے۔ جن قدروں یا شخصیتوں کو عزیز رکھتے ان کو ادبی تخلیق کا ہالہ عطا کردیتے۔ جو ان کی نظروں سے کسی نامعقولیت کی بنا پر گر جاتے وہ مسلسل ان کے اغماض کا شکار رہتے۔ اپنی ستائش سے گھبراتے لیکن دوسروں کی ستائش جی کھول کر کرتے۔ کہتے تھے "مرا اس میں کیا خرچ ہوتا ہے دوسرے کا جی خوش ہو جاتا ہے"! باہر کے بزرگ ادیبوں کے سامنے اپنے شعبے کے نوجوانوں اور ان کے کارناموں (یا ناکارناموں) کی تعریف اس انداز میں کرتے کہ مہمان گھبرا جاتا اور ممدوح شرما جاتا۔ انسانی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہر ایک کی حاجت روائی کرتے۔ سیکڑوں پر ان کے خاموش احسان ہیں۔ بعض احسان فراموش ہیں۔

علی گڑھ ان کی سب سے بڑی کمزوری اور طاقت دونوں تھا۔ اس سے ان کی والہانہ عقیدت کو نظر انداز کرتے ہوئے بعض اوقات میں اس مسئلے پر ان سے الجھ جاتا۔ وہ اس کی نسبت سے سارے ہندوستان کی تاریخ اور مقدر دیکھتے تھے۔ میں اسے ایک دجلہ کا قطرہ کہتا تھا۔ میری جرارت انکار پر بُرا ماننے سے زیادہ افسوس کرتے اور اپنی بات پر اصرار۔ ان کی علی گڑھ پرستی بڑھ جاتی اور میں متشکک کا متشکک رہ جاتا۔

رشید صاحب طبعًا ایک مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ خاص طور پر اسلام کی عظمت اور فوقیت کے مقر اور قائل۔ لیکن طاعت وزہد کی جانب عملی رجحان بہت کم تھا۔ اس لیے انھوں نے مذہبی مباحث اور فرائض سے بیشتر خود کو دور رکھا۔ لیکن ہندی مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت سے انھیں گہری دل چسپی تھی جو ان کی تحریر و تقریر دونوں سے ظاہر ہوتی ہے۔

سرسید کو وہ مسلمانوں کا مسیحا سمجھتے تھے اور علی گڑھ تحریک کو ان کی نشاۃ ثانیہ۔ سیاست میں وہ وسط سے دائیں طرف تھے۔ اس لیے وہ ادبی تحریکیں جن کا ماخذ کعبہ و کاشی سے دور ہوتا ان کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے۔ بنیادی طور پر وہ انسان اور قوم پرست تھے۔ اس لیے گاندھی، نہرو، محمد علی، اقبال، اور ذاکر حسین جیسی شخصیتیں ان کے تخیل کو گرماتی تھیں۔ ذاکر حسین سے ان کی عقیدت اب اُردو ادب کی ایک علامت بن چکی ہے۔ ان سے وہ بدظن اور خفا (جہاں تک مجھے علم ہے) صرف ایک بار ہوئے تھے جب وہ اچانک علی گڑھ چھوڑ کر بہار کی گورنری پر چلے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علی گڑھ چھوڑ کر جانا تھا تو جامعہ بازگشت کرتے جہاں ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے انھوں نے اپنی پیش کش کی تھی۔

جنوری ۱۹۷۳ء میں رشید صاحب کی تحریک پر میرا انتخاب جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کے اعزازی عہدے کے لیے ہوگیا۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میری نامزدگی عمل میں آئی۔ میرے لیے رشید صاحب کا مشورہ اور آشیرباد ضروری تھی۔ ملا تو کہا بڑی ذمہ داری سر پر آگئی ہے ضرور قبول کیجیے۔ میں نے کہا یہ کیا ظلم ہے کہ پہلے تو آپ نے ایک پٹھان کو شیخ بنا دیا اب چاہتے ہیں کہ ڈبل 'شیخ' ہو جائے۔ کہنے لگے کہ لطیفہ کو سنگین نہ بنایئے، اس سے لطف اٹھایئے اور کمر باندھ لیجیے۔

علی گڑھ سے تقریباً پانچ سال باہر رہا لیکن جامعہ اُردو کے ناتے سے ہر ماہ دو ماہ میں ایک چکر ضرور ہو جاتا۔ رشید صاحب کے در دولت پر میرے لیے حاضری ناگزیر تھی۔ ان کا قلم ابھی تک نہیں تھکا تھا۔ تابڑ توڑ وہ علی گڑھ

اور اس سے متعلق موضوعات پر لکھ رہے تھے۔ یہ تحریریں جا بجا چھپتی بھی رہیں، لیکن اب وہ مزاح اور طنز نگار نہیں تھے۔ خاکہ نگاری بھی چھوڑ دی تھی وہ اب علی گڑھ نگار تھے۔ کچھ ماضی کی یادیں، کچھ حال کے مناظر اور کچھ مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں۔ موجودہ علی گڑھ کی طرف سے مضطرب رہتے۔ اسی شدت سے ماضی کے علی گڑھ کی جانب بازگشت کرتے۔ اس کے حالِ زار پر ان کا اُس زمانے کا محبوب شعر یہ تھا ؎

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

ان کے مکان کے اندر کے سبزہ زار، گل و گلزار اسی طرح شاداب اور شگفتہ تھے۔ لیکن مالی بوڑھا ہو چکا تھا۔ عمر اسّی سے تجاوز کر چکی تھی مگر حوصلۂ قلم و رقم اب تک باقی تھا۔ ان کے انتقال سے قبل میں اکتوبر ۱۹۷۶ء میں آخری بار علی گڑھ گیا اور پہلی بار ان کے یہاں بعض مصروفیات کی بنا پر حاضری نہ دے سکا۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں اچانک خبر ملی کہ علی گڑھ کے چمن کا بلبل بھری بہار میں پرواز کر گیا!

ع مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اُداس ہے

رقعاتِ رشید! چند باتیں

رشید صاحب کے "ادبِ ممنوع" کو برسرِ عام لانے کی یہ جرأتِ رندانہ ان کی ہدایت اور اپنی شرافت کو خطرے میں ڈال کر کی جا رہی ہے۔ تمام دوستوں اور عزیزوں کو سخت اور مسلسل ہدایت تھی کہ ان کے خطوط ہرگز ہرگز ان کی حیات میں یا ان کے بعد شائع نہ کیے جائیں۔ اس ہدایت کی زد پر وہ بعض اوقات مکتوب الیہ کی شرافت تک کو لے آتے تھے۔

رشید صاحب، جہاں تک خطوط نویسی کا تعلق ہے۔ بسیار و زود نویس تھے۔ خطوط کا جواب جلد از جلد دینا ان کی عادت تھی۔ اس کے لیے انھوں نے ایک 'تکنیک' بھی ایجاد کر لی تھی۔ عام طور پر رقعوں اور پوسٹ کارڈوں کا استعمال، فوراً مکتوب الیہ کے خط کو پھاڑ کر اس سے نجات حاصل کرنے کی عادت (یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر سے جو سامان نکلا ہے اس میں اچھے سے اچھے مکتوب نگاروں کے خطوط مفقود ہیں!) اور پھر فوری طور پر انھیں پوسٹ کر دینے کی ہدایت۔ اس طرح ان کی "پابندیٔ رسمِ نیم ملاقات" مرتے دم تک جاری رہی جب کہ ان کی بینائی جواب دے چکی تھی، ہاتھ میں رعشہ آچکا تھا اور دماغ کی شریانوں میں دورانِ خون کی کمی کی وجہ سے مسلسل لذتِ آشیں کی سی کیفیت محسوس کرتے رہتے تھے۔

میں نے ان کے مکاتیب کو جان بوجھ کر 'رقعات' سے موسوم کیا ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے بیشتر رقعوں اور پرچوں پر لکھے گئے ہیں، کچھ اس وجہ سے کہ مکتوب الیہ مقامی تھا اور اس کا مکان ان کے دولت کدہ سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور کچھ اس سبب سے کہ رشید صاحب اپنے خطوط کے لیے مخصوص اسٹیشنری یا ڈاک کا بے جا خرچ اٹھانے کے قائل نہ تھے۔ جب ڈاک کے ذریعہ ترسیلِ خط منظور ہوتی تو پوسٹ کارڈ کا استعمال کرتے۔ اس میں کفایت کے علاوہ سہولت بھی تھی۔ ایک دفعہ کی گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ پوسٹ کارڈ کو لفافے (بند یا کھلے) کے مقابلے میں زیادہ پائدار سمجھتے تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ان کی ہدایت کے علی الرغم میں ان کے خطوط کو حرزِ جاں سمجھ کر محفوظ رکھتا ہوں اور نیّت بھی خراب ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ غالب کی طرح رشید صاحب اس بارے میں کہاں تک محتاط قلم ہو گئے تھے، لیکن یہ مسلم ہے کہ ان کے تمام خط قلم برداشتہ ہیں۔ بہت کم مقامات پر انھوں نے کسی لفظ یا جملے کو قلم زد کیا ہے۔

اس مجموعہ میں ان کا سب سے پہلا خط ۱۹۴۴ء کا ہے جب میں شعبۂ اُردو میں نیا نیا لکچرر مقرر ہوا تھا۔ یہ رسیدی قسم کا ہے لیکن قدامت کے پیشِ نظر شامل کر دیا گیا۔ ۴۴ ۱۹ء تا ۱۹۶۲ء کے بیشتر رقعات زائل ہو گئے۔ تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ میں علی گڑھ ہی میں تھا اور رشید صاحب سے مراسلت کا کاروبار ابھی نہیں کھلا تھا۔ ان کے خطوط کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۶۲ء کے بعد شروع ہوتا ہے جب میرا عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور میں علی گڑھ سے چھ سال کے لیے باہر چلا گیا۔ خطوط کی بڑی تعداد انھیں چھ سال سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دوران میں مختلف تعلیمی

کاموں کے سلسلے میں رشید صاحب نے دو بار حیدرآباد کا سفر میری خاطر اختیار کیا۔ ۱۹۶۸ء میں میں دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لسانیات کی پروفیسری پر آگیا۔ ہر چند کہ رشید صاحب سے سو قدم کے فاصلے پر رہتا تھا لیکن اگلے پانچ سالوں میں رقعات کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ رشید صاحب ان دنوں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے اندر مزاح نگار مرچکا تھا۔ اب وہ مسلسل سنجیدہ مسائل بالخصوص علی گڑھ کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ علی گڑھ ان کے لیے کچھ ماضی کی یادوں سے عبارت تھا، کچھ حال کے تشویشناک حالات سے اور کچھ نامعلوم مستقبل سے! اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی مجلے 'فکر و نظر' کا میں ایڈیٹر بھی ہو گیا تھا۔ ان کے اکثر رقعات میں اپنے ان مضامین کا تذکرہ ملے گا جنھیں وہ اس مجلے کے صفحات میں شائع کرانا چاہتے تھے۔ یا ان اداریوں کا تذکرہ جو میں نے اسی زمانے میں 'ہماری زبان' کے عارضی ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھے تھے۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وائس چانسلر ہو کر میں پھر پانچ سال کے لیے علی گڑھ سے غائب ہو گیا۔ کچھ میری منصبی مصروفیات، کچھ ان کی گرتی ہوئی صحت۔ خطوط کم تر آنے جانے لگے، اور موضوعاتِ گفتگو بھی سمٹ کر رہ گئے۔ میں کاروباری بنتا گیا اور وہ گراں قلم۔ رشید صاحب سے بہتر مکتوب لکھوانے کے لیے انھیں 'برانگیختہ' کرنا ضروری ہوتا تھا۔ ان کی فکر مصرعوں اور فقروں کی فکر تھی۔ اس لیے دوسرے کے پھڑکتے ہوئے جملے یا برمحل نقلِ شعر کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اکثر لکھتے مجھے یہ کیوں نہیں سوجھا اور اس کے ساتھ ان کے ذہن کا دبستاں کھل جاتا۔

رشید صاحب بنیادی طور پر ایک 'دروں بیں' شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی شخصیت اپنے نجی رشتوں اور تحریروں میں احتیاط اور دیر سے کھلتی ہے۔

خاص طور پر اگر مکتوب الیہ اس کا ہمدم وہمراز نہ ہو۔ رشید صاحب کی نسبت سے مجھے یہ درجہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ گو وہ مجھ پر طالب علمی کے زمانے سے شفقت کرتے تھے اور ادبی وعلمی معاملات میں میں ان کا معتمد علیہ تھا۔ زندگی کا بڑا حصہ ان کی رفاقت میں گذرا۔ لیکن ہمیشہ " بادیم " میں ایک نہایت دوری قائم رہی جیسا کہ خطوط میں الفاظ خطاب سے ظاہر ہے۔ " مکرم " جو مکتوب نویسی میں ایک غیر جانب دار، بے رنگ اور رسمی خطاب ہے۔ انھوں نے زیادہ تر مجھے اسی لفظ سے یاد کیا ہے۔ کبھی کبھی 'وفور کرم ' میں 'محترم ' بھی لکھ جاتے تھے جس پر میں مجوب ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح ان کے خطوط کا خاتمہ ہمیشہ لفظ 'مخلص ' پر ہوتا جسے پھر میں رسمی سمجھتا ہوں۔

مکتوب نویسی میں ان کے اس رویے کے باعث رشید صاحب اپنے رقعات میں بہت کم بے پردہ ہوئے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ذاتی غم کی لہر پر جیسا کہ خط نمبر ۲ میں اپنی چھوٹی اور عزیز بیٹی منّی کی جواں میری پر بلبلا اٹھے ہیں۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء کے بعض خطوط میں اپنی گرتی ہوئی صحت اور بڑھاپے کے عوارض کا ذکر نہایت پژمردگی سے کرتے ہیں اور ع رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو' کے آرزو مند ہیں۔

سماجی نقطۂ نظر سے رشید صاحب کی شخصیت کا سب سے مثبت پہلو جو ان رقعات سے بخوبی ظاہر ہے چھوٹوں کے ساتھ ان کی کریم نفسی ہے۔ ان کی فیض بخشی سے بہرۂ وافر مجھے بھی ملا تھا۔ ہماری زبان کی عارضی ادارت کے زمانے میں انھوں نے ہر ادار یے پر جو رقعات مجھے لکھے ہیں وہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں۔

علم وادب کے معاملات کے لیے وہ مجھ پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے

تھے جیسا کہ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۳ء کے خطوط سے ظاہر ہے۔ اس دوران جو بھی لکھتے
شائع کرنے سے قبل میری نظر سے ضرور گزارتے۔ دہلی یونیورسٹی کے توسیعی خطبے
کے لیے انھوں نے غالب اپنا موضوع منتخب کیا تو میری مدد چاہی اور یہ
میں نے بھرپور دی۔ اس دوران جو خطبے تحریر کیے مجھ سے بار بار مشورہ
کرتے رہے۔ وہ ایک نہایت ذہین انسان تھے 'تھوڑے' کو 'بہت' کر دینا
ان کے قلم کا کھیل تھا۔ وہ صحیح معنیٰ میں ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔
یہی وجہ ہے کہ ان کے رقعے اور پرچے آج تک ہمیں عزیز ہیں۔

۱

۲۹ ستمبر ۱۹۴۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب،

مٹھوں کا بہت بہت شکریہ، جو سرور[1] صاحب کی معرفت موصول ہوئے۔ اتنے بڑے بڑے دانے میں نے کم دیکھے تھے اور پھر اس کثرت سے۔ مدت ہوئی ایک بار ذاکر صاحب[2] بہت سارے لائے تھے تو لطف اٹھانے کا موقع ملا تھا۔

سرور صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ بنارس سے واپس آ گئے۔ امید ہے آپ کی منشا کے مطابق وہاں مواد مل گیا ہوگا۔

ذاکر صاحب کی بچی اب تک علیل ہے۔ اللہ فضل فرمائے۔

آپ کا

رشید صدیقی

---

[1] پروفیسر آل احمد سرور، جو اس وقت شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں، لکچرر تھے۔

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین

[3] بنارس میں اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں مواد تلاش کرنے گیا تھا۔

۲

ذکاراللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ
۱۰ر اپریل ۱۹۵۹ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم
خط ملا۔ آپ نے جس محبت سے اس سانحے میں ہم سب کے ساتھ اظہار ہمدردی فرمایا اس کے لیے شکر گذار ہوں[1]۔ کیا کہوں کہ کیا گذر گئی اور گذر رہی ہے۔ کتنی بے شمار باتیں یاد آتی ہیں اور طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے۔ وہ باتیں جو اس کی زندگی میں کبھی نہیں یاد آئیں۔ کیسی کیسی معذوریوں کے باوجود اس کے لیے کیسے کیسے منصوبے بنا رکھے تھے! صبر کس طرح آئے اور غم کا خوگر کس طرح بنوں، جب وہ ہر بار نئے سرے سے یاد آتی ہے۔ اسی طرح کی باتیں کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا سلسلہ بھی دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے خدا حافظ۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] یہ تعزیتی خط میں نے امریکہ سے رشید صاحب کی سب سے چھوٹی بچی اسما رشید عرف منّی کے انتقال پر لکھا تھا۔

۳

۲۵ر جنوری ۱۹۶۱ء

مسعود صاحب مکرم. تسلیم

کچھ معلوم نہ ہوا آپ نے اپنا تفصیلی خاکہ[1] مرتب کر لیا یا نہیں۔ تاکہ سب لوگ مل کر اس پر گفتگو کر لیتے۔ پرسوں احسان کے ہاتھ ایک خط اس مقصد کے سلسلے میں بھیجا تھا، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ معلوم نہیں آپ کو ملا بھی یا نہیں۔ کام جلد شروع کر دینے میں فائدہ یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ اکثر احباب بڑے تقاضے اور خوشامد کے طلبگار ہوں گے۔ اس کی بھی تو گنجائش رکھنی ہے۔ خاکے کی تفصیل اس لیے چاہتا ہوں کہ اس طرح ہر شخص کے سپرد فیصلہ شدہ موضوع مع ابواب و فصول کے کر دیا جاتا اور لوگ نادانستہ طور پر ایک دوسرے کی حدود میں داخل نہ ہو سکتے۔ یوں جیسے آپ کی مرضی ہو۔

آپ کا

رشید صدیقی

---

[1] اشارہ "علی گڑھ تاریخ ادب" کی جانب ہے جس کا خاکہ رشید صاحب کی ایما سے میں نے تیار کیا تھا۔

۴

۱۲ر جون ۱۹۶۲ء
ذکار اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، آداب
نوازش نامہ مورخہ ۱۵ر پرسوں صادر ہوا جس میں احسان[1] کے نام ایک خط بھی ملفوف تھا۔ میں نے ان کو دونوں دے دیئے کہ وہ پڑھ لیں لیکن وہ ان بے وقوفوں میں ہیں جو خط کا بروقت جواب دینے میں اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں یا کاہلی کو سندِ جواز مانتے ہیں اور یہ دونوں باتیں نالائقی کی دلیل ہیں۔ یہ معلوم کر کے خوش ہوا، گو یہ خوشی غیر متوقع نہ تھی کہ آپ حیدرآباد کے اپنے اس نئے منصب، نئے رفقار کار، نئی جولاں گاہ اور نئے لیل و نہار سے خوش و مطمئن ہوں گے[2]۔ مکان مل گیا اور اب وہاں کی خوشیاں اپنے متعلقین کے ساتھ منائیں گے۔ اس

---

[1] پروفیسر احسان رشید صدیقی، رشید صاحب کے دوسرے صاجزادے۔ سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی۔

[2] میں نے جون ۱۹۶۲ء میں پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کا چارج لیا تھا۔

کی اور زیادہ خوشی ہے۔ زندگی کی بڑی نعمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے
۔ مجھے یقین ہے حیدرآباد میں آپ نام وری بھی حاصل کریں گے اور
نیک نام بھی رہیں گے۔ آپ کو اللہ نے وہ نعمتیں دی ہیں کہ کم ظرفوں
حاسدوں کی ریشہ دوانیاں آپ کی دل چسپی کا موجب ہوں گی خلجان
کی۔ آپ حیدرآباد میں اپنے لیے ایسا مقام بنالیں گے جو
آپ کی خاندانی روایات اور ذاتی صفات کے عین مطابق ہوگا۔ اس
سے علی گڑھ کا بھی نام روشن ہوگا۔ یہاں کے دنی الطبع لوگوں کا
خیال بالکل دل سے نکال ڈالیے، ایک فارسی شاعر نے بھی اس کی ہدایت
کی ہے، جس نے کہا ہے: بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی!
اس دفعہ کا فکر و نظر[1] اپنے مقررہ میعار کے مطابق نہیں نکلا۔
اس کے لیے تھوڑا سا وقت اِدھر اُدھر سے بچا کر کچھ لکھ دیا کیجیے۔
آپ نے غالب کا ایک شعر لکھا ہے، دوسرا مجھ سے سنیے، کچھ اس طرح
کا احساس ہے جیسے آپ اسے quote کر رہے ہوں:

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کُنشت کو

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تحقیقی سہ ماہی مجلّہ

۵

ذکاء اللہ روڈ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۳ ستمبر ۶۲ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

خیال ہے کہ ستمبر میں دو تین ہفتے کے لیے آپ یہاں تشریف لائیں گے جیسا کہ فرما گئے تھے۔ اگر آسانی سے ممکن ہو تو ایک ٹوکری میں چند پودے حیدر آباد کے عمدہ قسم کے پپیتے کے لیتے آئیے گا، یہاں وہ قسم ناپید ہے۔ ذاکر صاحب یہاں تھے تو حیدر آباد کے بڑے عمدہ اور غیر معمولی سائز کے پپیتے لایا کرتے تھے یا کوئی بھیج دیتا تھا۔ اس طرح کی مستند پود کہاں اور کیسے ملے گی اس بارے میں ممکن ہے سروری[1] صاحب آپ کی مدد کر سکیں، عبد الغفار شکیل[2] بلائے ہوئے آئے ہیں، دیکھو ڈپارٹمنٹ میں کیا مقام ملتا ہے اور ملتا بھی ہے یا نہیں! ایک شام ملنے آئے تو اسی طرح کی گفتگو کرتے رہے میں نے اکثر

---

[1] پروفیسر عبد القادر سروری، سابق صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

[2] ڈاکٹر عبد الغفار شکیل، لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

انفیر بتایا کہ ان کی حیثیت بظاہر اُس شخص کی معلوم ہوتی ہے جو دوسروں کے لیے "بستر گرم" رکھنے کے لیے مامور ہوتا ہے۔ سب کو سلام دعا

آپ کا
رشید صدیقی

یوسف صاحب کے خلاف Blitz وغیرہ نے زہر اگلنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ موصوف کے لیے کوئی اچھی جگہ کا بندوبست ہونے والا ہو۔

۶

۱۶ر اکتوبر ۶۳ء

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، آداب

آپ کا ۱۰ر کا نوازش نامہ کل ۱۵ر کو ملا۔ چھٹے دن! حیدرآباد سے اتنے دنوں میں پہلے کبھی ڈاک نہیں ملی تھی۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ خط تو اِدھر اُدھر نہیں ہوا جو حال ہی میں آپ کو میں نے لکھا تھا کہ شیروانی کے کپڑے (ہمرو) کا خیال ترک کر دیا گیا، اب تو وہ اسکارف یا چھوٹی چادر درکار ہے جس کو خواتین کام میں لاتی ہیں اور بالعموم بطور زیبائش شانوں پر ڈال لیتی ہیں۔ ہمرو کا جو نرخ آپ نے لکھا ہے اور جو نمونے بھیجے ان سے تو یہی اندیشہ ہوتا ہے کہ سروری صاحب نے اس بار جو ٹکڑا لاکر دیا تھا جس کا قصہ آپ کو معلوم ہے وہ اس تخمینی قیمت سے زیادہ کا ہے جو میں نے آپ کی معرفت بھیجی ہے۔ موصوف کا یہ تکلف کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ صحیح قیمت کے بجائے بہت گھٹا کر اس کی قیمت بتاتے ہیں اور جب وہ روپے ادا کیے جائیں تو قبول کر لیں۔ یاد آتا ہے کہ بڑے اصرار پر انھوں نے اس ٹکڑے کے دام کُل [illegible] بتائے تھے۔ حالاں کہ نرخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس

روپے سے زیادہ کا ہے۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا۔

بڑی خوشی ہے کہ آپ عنقریب دہلی آئیں گے اور وہاں کے بعد یہاں کا بھی ایک چکر لگائیں گے، ممکن ہے اس وقت تک احسان بھی آجائیں ان کا پروگرام مکمل ہو چکا ہے۔ احسان ۲ر کو چلے گئے اب وہاں سب ٹھیک ٹھاک کر کے آئیں گے، ممکن ہے آپ سے یہاں ملاقات ہو جائے۔ علی گڑھ کے حالات اب یہیں آکر دیکھئے سنیے گا۔

آپ کا

رشید صدیقی

۷

۲۰؍ اکتوبر ۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب، محترم

گرامی نامہ مورخہ ۱۶؍ اکتوبر۔ ہمرو کے پیچھے تو میں آپ کے لیے وبالِ جان بن گیا۔ میرا پچھلا خط ملا ہوگا جس میں عرض کیا گیا ہے کہ شیروانی کا خیال ترک کر دیا گیا اب تو صرف ایک زنانہ اسکارف کی ضرورت ہے جو سیاہ نہ ہو، کسی اور گہرے اور ہلکے رنگ کا ہو اور اس کی قیمت ۵ے اور ۱۰ے کے درمیان ہو۔ پچھلی بار سروری صاحب نے جو فراہم کر دیا تھا اس کی قیمت میرے اصرار پر صرف ۲۰ے بتائی گئی۔ واللہ اعلم! بہرحال اتنا تو دریافت فرما ہی لیجیے گا کہ ہمرو کا ایک عمدہ زنانہ اسکارف (یا مختصر چادر) کس قیمت کا ملتا ہے۔ احسان ابھی آئے نہیں، آتے ہوں گے لیکن پھر جانے کے لیے۔ ان دنوں میری طبیعت بحال نہیں ہے۔ لیکن اس کا شکوہ کیا!

آپ کا

رشید صدیقی

۸

ذکاراللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۳ر اکتوبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم، آداب

کوئی صاحب حیدرآباد کے احمد جلیس[1] یہاں آئے تھے اور پرسوں یا ترسوں مجھ سے ملنے دوبارہ گھر پر تشریف لائے۔ ایک رات پہلے سے میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے مل نہ سکا۔ چلتے وقت ایک شکایتی فقرہ لکھ کر واپس حیدرآباد ہو گئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مل نہ سکا۔ اگر وہ کبھی آپ سے ملیں تو میری طرف سے معذرت کر دیجئے گا۔ ملنے ملانے اور دیر تک گفتگو کرنے سے بچتا ہوں تاوقتیکہ کوئی شناسا، بے تکلف اور مخلص دوست نہ ہو۔ "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" قسم کا آدمی میں نہ ہوں، نہ بننا چاہتا ہوں۔ اس لیے حتی الوسع ملاقات، دید باز دید وغیرہ سے بچنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس دفعہ تو طبیعت ہی نہیں اچھی تھی۔ رات کو کئی دست اور قے، بغیر کسی بے احتیاطی کے ہو چکے تھے، طبیعت نڈھال تھی اس لیے نہ مل سکا۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] احمد جلیس صاحب جو بعد کو آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں چلے گئے تھے۔

۹

۱۳ نومبر ۶۲ء
ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم
آپ کے رجسٹرار صاحب کے دفتر سے ۸ کا لکھا ہوا خط مجھے کل ملا جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ نتیجہ مطلوبہ[1] ۱۶ نومبر کو وہاں پہنچ جائے یہ ممکن کیسے ہے؟ زرا آپ ان صاحب کو سمجھا دیجیے کہ مفوضہ فریضہ میں دماغ پاشی کرنی پڑتی ہے گھاس کاٹنا نہیں ہوتا میں تو صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ جلد سے جلد اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں۔

ان صاحب[2] کا سوال نامہ مع آپ کے خط کے مجھے مل گیا۔ ان کا طریقہ اور لب ولہجہ مجھے پسند نہیں آیا۔ ان کے نام کی ڈاک

---

[1] انتخاب اُردو، برائے پری یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی

[2] ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید جو اس وقت رشید صاحب پر اپنا ایک تحقیقی مقالہ میری نگرانی میں تصنیف کر رہے تھے اور اس سلسلے میں علی گڑھ کا بھی چکر لگایا تھا۔

بھی میرے نام سے آنے لگی ہے۔ اسے بھی میں اچھی بات نہیں سمجھتا۔
آپ تو جانتے ہی ہیں انٹرویو لینے اور دینے سے کس قدر بچنے کی
کوشش کرتا ہوں۔ اسی طرح جو شخص اس پر اصرار کرتا ہے اس
کے بارے میں میرا ردّ عمل کیا ہوگا

آپ کا
رشید صدیقی

۱۰

۱۵ر نومبر ۶۲ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
میں نے پرچہ بنا کر آج بھیجدیا۔ مقررہ میعاد سے دو ایک دن دیر میں ملے گا لیکن اس سے مفر نہ تھا یہ یونیورسٹی کے دفتر کی غلطی ہے کہ خط ۸ر کو لکھتے ہیں اور پوسٹ ۱۲ر کو کرتے ہیں اور ستم یہ کہ ۱۹ر کو پرچہ طلب کرتے ہیں۔
اطہر جاوید صاحب کی کارگذاری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر چکا ہوں۔ پورے طور پر نہ تو میں نے ان کا خط پڑھا تھا نہ آپ کا۔ آج کاغذوں میں مل گیا تو حالات معلوم ہوئے۔ یہ میری غلطی تھی کہ یہ کاغذات پاکر اتنی طبیعت منغض ہوئی کہ بذریعہ تار جواب نہ دے سکا کہ موصوف تکلیف نہ فرمائیں۔ حالاں کہ اگر اس وقت دے دیتا تو ان کو بر وقت مل جاتا۔ اب تو ان کے نام کے خطوط بھی میرے توسط سے آنے لگے ہیں۔ یہ بے تکلفی بھی مجھے پسند نہ آئی۔ انھوں نے اپنی تحقیقات

کے سلسلے میں میرے سارے خاندان کو لپیٹ لیا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے لیکن ہر شخص اس پر تو مجبور نہیں ہے کہ وہ اس کی تائید کرے۔ آپ کو اٹھارہ روپے کا ایک منی آرڈر عرصہ ہوا بھیجا تھا مل گیا ہوگا۔ رسید نہ آئی۔

آپ کا
رشید صدیقی

۱۱

ذکا راللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۰ر نومبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم، آداب

۱۷ر کا والا نامہ ملا۔ کل سلمان اطہر جاوید صاحب آئے اور مہرو اور دام حوالہ کیے۔ کپڑا بہت پسند آیا۔ اطہر جاوید صاحب بھی۔ آپ نے میری طرف سے ان کو اس درجہ سہما دیا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے خول سے باہر نکلنے کی جرأت کرتے تھے۔ اس سے میری نظر میں اپنی نا لائق اوقات سے نفرت بڑھ گئی، لیکن میں نے اطہر صاحب کی مشکل آسان کر دی یعنی ان کو حقوق شہری rights of citizenship دے دیا ہے یعنی جب جہاں چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں اور بے تکلف ہو سکتے ہیں۔ کیا کرتا!

دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے!

نسیم لکھنوی کا پہلا مصرع آپ کو یاد ہوگا یعنی:

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو!

"دیوانے" سے مراد آپ نہیں، یہ اس لیے لکھنا پڑا کہ واقعی جو دیوانہ

ہے یعنی میٹ۔ اس کی طرف آپ کا ذہن منتقل نہ ہو۔ ذاکر صاحب نے اطہر جاوید سے ملنے کے لیے ۲۲ر نومبر مقرر کیا ہے۔ پرچہ اب تک رجسٹرار صاحب کی خدمت میں پہنچ چکا ہوگا۔ احسان یہیں ہیں۔ ان کے پروگرام کی شاید ان کو بھی خبر نہیں ہے۔ البتہ انھوں نے اطہر صاحب کی مدارات میں ہر طرح کی کوشش کی۔ یوسف صاحب[1] خیریت سے ہیں اور خوش و خرم۔ ان کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادی سلمہا دبلی گئی ہوئی ہیں۔ ہاں ایک بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مرسلہ ھمروکا اسکارف بہت عمدہ ہے ہر اعتبار سے جس کے لیے آپ کا شکرگذار ہوں۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔

(۱۲)

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۸ دسمبر ۱۹۶۲ء دو شنبہ

مسعود صاحب، مکرم
کئی دن ہوئے نوازش نامہ ملا تھا جس میں آپ نے سلیمان اطہر صاحب کے واپس حیدرآباد پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی اور اس امر کا بھی اظہار کیا تھا کہ یہاں آپ کے مکان کا کرایہ حسب دل خواہ طے ہو گیا۔ سلیمان صاحب سے کئی موقعوں پر مختلف مباحث پر گفتگو کا سلسلہ رہا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انھوں نے کوئی گفتگو نہ کی، میں ہی کرتا رہا۔ اس سے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ میں اپنا مطلب واضح کر سکا یا نہیں اور خود انھوں نے ان باتوں کے صحیح import کو سمجھا یا نہیں۔ میں تو اپنے ذاتی تاثرات یا عقائد کا ذکر کرتا رہا اور "تاثرات اور عقائد کو آج کل "متاعِ کاسد" سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی جب کوئی شخص (وہ بھی ایک معصوم طالب علم) اس طرح مسلط ہو جائے! آپ کو یہ باتیں اس لیے بتانا پڑیں کہ آپ ان کے کام کے نگراں ہیں۔ آپ کے ذہن میں یہ بات رہے کہ کون سی بات کس سیاق و سباق میں کی گئی ہے۔ ہر بات باضابطہ ضبطِ تحریر میں لانے کی نہیں ہوتی چاہے وہ براہِ راست سننے

میں آئی ہو۔ آپ جانتے ہیں اپنے "محاسن" سے آراستہ ہو کر نہ کتابوں میں جگہ لینا مجھے پسند ہے نہ اپنے "معائب" کو طشت از بام کرنے یا ہونے دینے کی جرأت ہے۔ میں وہیں رہنا چاہتا ہوں جہاں ہوں۔ ٹیلیویژن کی زد میں آنا نہیں چاہتا۔ یہی درخواست عزیزوں اور دوستوں سے ہے۔ زندگی میں نہیں تو امید ہے مرنے کے بعد اس کا خیال رکھیں گے۔ اگر سلیمان اطہر صاحب لفظ بہ لفظ "بین الاوین" وہ باتیں لکھ ڈالیں جو ان کی خاطر میں کہتا گیا تو یہ بھدّی بات ہوگی۔ یہ تو ان کی ذہنی فضا یا افق کو واضح اور روشن تر کرنے کے لیے کہی گئی تھیں۔ نہ کہ "بیان استنا نہ" یا "جواب ملزم" کے طور پر!

میرے پاس مضامین کا جو غیر مرتب گڈمڈ پلندہ تھا وہ میں نے ان کے مطالعہ کے لیے دے دیا تھا۔ اس میں سے ایک حصّہ تو انھوں نے ہمیں واپس کر دیا، بقیہ کے لیے کہا کہ آپ کی معرفت بھیج دیں گے۔ آپ مارچ میں تشریف لائیں تو ہمراہ لا ئیے گا۔ ڈاک سے بھیجنے کا انتظام نہ کیجیے گا۔ میرے پاس بھی تو وہ یونہی کباڑ کے طور پر پڑا رہے گا ——— آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا، لیکن نہ غم عشق کی نہ غم روزگار کی بلکہ ویسی ہی جو برسبیل تذکرہ سامنے آجاتی تھیں جب آپ یہاں تھے اور ملاقات ہوا کرتی تھی ان کو نہ لکھنے کی سکت نہ ضرورت۔ احسان یہیں ہیں، کسی وقت تقریب کے سلسلے میں چلے جائیں گے۔ آپ کا خط مل نہیں رہا ہے شاید پڑھنے کو ان کو دے دیا تھا۔ ان سے کون پوچھے کہ وہ کہاں ہے یا کدھر گیا۔ غالبًا آپ نے ایسی بات نہیں لکھی تھی جس کا جواب دینے سے رہ گیا۔

خواجہ مجید[1] صاحب گذشتہ اتوار کو رحلت فرما گئے، یہاں کے مسلمانوں کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھے، اب کوئی نہیں رہا۔ لیکن اس کا ماتم کیا؟ یہ تو روز ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن جب یہ حادثہ کسی اپنے پر گذرتا ہے تو دل کا عالم ہی عجیب ہوتا ہے۔ زندگی یا زمانہ کسی کے غم یا خوشی کے پابند نہیں وہ کسی کا احترام نہیں کرتے لیکن وہ غریب بھی کیا کریں وہ بھی تو مجبور ہیں، وہ کب گزرنے اور گزرتے رہنے سے باز رہنے دیے جاتے ہیں۔

سردی کچھ چمک گئی تھی اب اعتدال پر ہے، سب کو دعا

مخلص

رشید صدیقی

فکر و نظر کے لیے کچھ لکھ ڈالیے۔ اب تو کچھ سکون ہو گیا ہوگا۔ یوسف صاحب سے کل شام ہی ملا تھا۔ خوش و خرم ہیں اتنے کہ اپنے آزار کے علاج کی طرف متوجہ ہونے سے بھی بے نیاز!!

---

[1] عبدالمجید خواجہ صاحب

۱۳

۲۷ر دسمبر ۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

محبت نامہ کل ملا۔ ان دنوں viva کے سلسلے میں سروری صاحب تشریف لائے تھے۔ مختلف باتوں پر گفتگو رہی جس کا حال انھوں نے سنایا ہوگا۔ میں نے اتوار کو سروری صاحب کے بارے میں عابد صاحب[1] کو خط لکھ دیا تھا، وہ منگل سے پہلے ان کو ملا نہ ہوگا۔ لیکن خود سروری صاحب عابد صاحب سے اتوار کو مل لیے ہوں گے اور موخر الذکر کو ردِ عمل بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔ ممکن ہے دو ایک دن میں عابد صاحب کا بھی خط آتا ہو۔ ہمارے قبیلے کی دقت تو یہی ہے کہ کتنی ہی معقول بات کیوں نہ کہیں اس کو ملاءِ اعلیٰ تک پہنچائیں کیسے؟ آپ نے جس ۔۔۔[2]۔۔۔ طرف اشارہ کیا ہے ممکن ہے اس کے لیے قرائن موافق ہوں لیکن کیا معلوم کہ آخر وقت میں کیا پیش آجائے۔ مثلاً "قِرانُ السعدین"

---

[1] ڈاکٹر سید عابد حسین

[2] اصل میں صرف نقطے

ہی نہ ہو پاے۔ "اشٹ گرہ" کی ساعت آنے میں کیا دیر لگتی ہے جب کہ وہ ایک طور پر نازل بھی ہو چکی ہو۔ بہر حال۔۔۔۔۔

ان دنوں کراچی سے اقبال[1] آگئے تھے۔ ۸۔۹ دن بعد کل وہ بھی جائیں گے۔ میں ان سب کے آنے اور ملنے سے گھبراتا ہوں اس لیے کہ پھر جلد یا بدیر ان کی جدائی کا کرب ساری خوشیوں کو پامال کر جاتا ہے اور اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ احسان بھی عنقریب ہی چلے جائیں گے۔ آپ کا خط ان کو دکھا دیا ہے۔ علی گڑھ کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہوگا وہ صحیح ہوگا۔ لیکن نظرِ بد لگنے میں بھی دیر نہیں لگتی، کیا معلوم کب ہوا کا رُخ کدھر جاے۔ اِدھر آ کر کیا کیجیے گا۔ جب آنے کا مقصد حاصل ہو چکا ہو۔ زندگی ہے تو مارچ میں ملنے کا اتفاق ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] اقبال رشید صدیقی۔ رشید صاحب کے بڑے صاحب زادے

۱۴

۲۲ر جنوری ۶۳ء

ذکاراللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

۱۸ر کا نوازش نامہ پرسوں ملا۔ اتفاق سے اسی دن سروری صاحب سے بہ ہمرہی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب[1] غریب خانے ہی پر ملاقات رہی اور تا دیر ہر طرح کے مسائل اور وسائل پر گفتگو رہی۔ کل صبح واپس گئے ہوں گے اور اس خط سے پہلے غالباً حیدر آباد پہنچ جائیں گے۔ ان سے مل کر آپ کو صورتِ حال معلوم ہو گی جب تک کوئی مربّی نہ ملے کام چلتا نہیں اور ہم کو، آپ کو جیسے مربّی ملتے ہیں اور مل سکتے ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں۔ اور کیا لکھوں، زندگی کا کام چل رہا ہے اور چلتا رہے گا، اس لیے کہ اس کو چلانے والے کی ضرورت نہیں۔ "قاطع اعمار" نجوم ہی نہیں امراض و اشخاص بھی ہوتے ہیں جن کی علی گڑھ میں کیا کہیں کمی نہیں۔ امید ہے آپ خوش و خرم

---

[1] پروفیسر نذیر احمد جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبۂ فارسی تھے۔

ہوں گے۔ بیوی بچّے بھی۔ احسان ابھی یہیں ہیں۔ عید کے چاند میں انشاء اللہ تقریب[1] ہوگی۔ اب تک تو یہی معلوم ہے اور توقع بھی ہے۔

آپ کا
رشید صدیقی

کچھ فکر و نظر کے لیے نہ لکھیے گا؟

---

[1] اشارہ ڈاکٹر احسان رشید کی شادی کی جانب ہے جو سر راس مسعود کی صاحبزادی نادرہ مسعود سے ہوئی تھی۔

۱۵

ذکاء اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۳ر جنوری ۱۹۶۳ء

مسعود صاحب مکرم و محترم۔ آداب
بعض احباب میرے نجی خطوط جو وقتاً فوقتاً میں نے ان کو لکھے ہیں یا میرے فراموش شدہ مضامین نیز میری سیرت و شخصیت کے خدو خال کو منظرِ عام پر لانے کی غرض سے رسائل یا اخبارات کے خاص نمبر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جہاں تک پتہ لگ سکا ان عزیزوں کو بڑے ادب و اخلاص سے ممانعت کے عریضے لکھ دیئے ہیں۔ قرائن سے پتہ چلا ہے کہ یہ کافی نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے موقر اور کثیر الاشاعت اخبار یا رسالے سے اعانت کا خواستگار ہوں چنانچہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ:
(۱) میرے نجی خطوط، نجی تحریریں یا متذکرہ بالا مضامین کی کسی بہانے اشاعت کی جائے۔ ان کو کہیں منتقل یا محفوظ کر دیا جائے بلکہ ان کو یکسر تلف کر دینا میری عین شکرگذاری کا موجب ہوگا

(۲) میری حیات میں یا مرنے کے بعد اخبارات و رسائل کے خصوصی نمبر شائع کیے جائیں۔

(۳) میری یادگار قائم کرنے یا منانے کے لیے کسی قسم کا چندہ یا عطیہ قبول کیا جائے یا پیغامات منگانے یا شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ میری اس درخواست کے خلاف جتنی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں ان سے میں ناواقف نہیں ہوں، لیکن یہاں اس طرح کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ ان کو قبول فرمایا جائے۔

بایں ہمہ اگر کسی نے اس گزارش کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر وہ کیا جس کے نہ کرنے کی میں نے التجا کی ہے تو میں ان کو اپنے نزدیک شریف آدمی نہیں سمجھوں گا اور شاید وہ لوگ بھی نہ سمجھیں جو مجھے یا میری اس استدعا کو آج یا مرنے کے بعد بھی چند دنوں قابلِ لحاظ خیال فرمائیں گے۔

ہندوستان اور پاکستان کے جملہ اُردو اخبارات و رسائل کے

یہ خط دراصل ایک ٹائپ شدہ گشتی مراسلہ کا مسودہ ہے جو "ایک معروضہ" کے عنوان سے رشید صاحب نے اُردو کے موقر اخبارات و رسائل کے مدیروں کی خدمت میں بھیجا تھا۔ تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسی کو نجی خط بنا کر مجھے ارسال کیا تھا۔ اس کے ساتھ ملفوف اگلا خط بھی تھا جس میں رشید صاحب رقم طراز ہیں: "میں نے اس کو بعض اُردو اخبارات میں چھپوانے کا ارادہ کیا تھا لیکن احسان نے سختی سے مخالفت کی....."

مہتمم اور ایڈیٹر صاحبان سے گزارش ہے کہ اس معروضے کو بجنسہٖ
ورنہ اس کا خلاصہ شائع فرما کر مجھے ممنون کرم فرمائیں، گو ان کے
کرم کو صرف اپنے ممنون ہونے سے بدرجہا ارفع سمجھتا ہوں۔

خاکسار

رشید احمد صدیقی

۱۶

۲۴ر جنوری ۱۹۶۳ء

ذکار اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

کل ڈاکٹر محمد حسن[1] نے یہ خبر سنائی کہ اخوت نامی کوئی اُردو اخبار کلکتے سے شائع ہوتا ہے جس کے ایڈیٹر کوئی ایسے صاحب ہیں جو یہاں کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ اسی اخبار میں وہ انٹرویو شائع ہوا ہے جو آپ کے سلیمان اطہر جاوید صاحب نے (غالباً یہی نام ہے) ذاکر صاحب سے میرے متعلق دہلی میں لیا تھا۔ ظاہر ہے اطہر صاحب کی ایما سے یہ ہوا ہوگا ورنہ کسی اور کو اس انٹرویو کی تفصیل کی کیا خبر تھی اور اس کو اخبار میں شائع کرنے کی کیا پڑی تھی! یہ کام اطہر صاحب نے نہایت قابل اعتراض کیا۔ آپ کے تعارف و توسل سے میں ان کو حیدر آباد کے کسی اچھے گھرانے کا شریف و سعادت مند نوجوان سمجھتا تھا اس لیے ان کی پذیرائی میں نے اور احسان نے بڑے تپاک سے کی اور وہ جو کچھ چاہتے تھے (تحریر و تقریر سے) وہ کیا لیکن اپنے نام اور کام کو اچھالنے

---

[1] پروفیسر محمد حسن، شعبۂ اُردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

کی خاطر ذاکر صاحب کو اور مجھے جس طرح منظر عام پر گھسیٹ لائے اس کے بارے میں معمولی سے معمولی الفاظ بھی استعمال کروں تو وہ بھی سخت ہوگا اس لیے اس سے احتراز کرتا ہوں۔ انھوں نے میری توہین کی۔ جسے معاف کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ میں آپ پر مطلق احسان نہیں جتاتا اور آپ محسوس کرتے ہوں گے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کا واسطہ نہ ہوتا تو میں ان کو اپنے دروازے میں گھسنے نہ دیتا۔ انٹرویو چاہنے والوں کی میں نے کبھی ہمت افزائی نہ کی۔ جب چڑیاں کھیت چگ چکیں تو پھر کیا جا سکتا ہے لیکن چاہتا ہوں کہ جو میٹریل تحریر و تقریر یادستاویز کی شکل میں میں نے ان کے حوالے کیے وہ سب کا سب مجھے واپس کردیں کیوں کہ جو کچھ وہ پوچھتے گئے اُسے میں نہایت تفصیل سے بتاتا گیا اور وہ سب قلم بند کرتے گئے۔ یہ سب اب ناممکن معلوم ہوتا ہے البتہ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ میں اطہر صاحب کو کس ٹائپ کا آدمی سمجھتا ہوں۔

ملفوظ ٹائپ شدہ عبارت پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیجیے اور مرے مرنے کے بعد یا ضرورت ہو تو اس سے پہلے بھی اس کے مطابق عمل درآمد کیجیے گا۔ میں نے اس کو بعض اُردو اخبارات میں چھپوانے کا ارادہ کیا تھا لیکن احسان نے سختی سے مخالفت کی انھوں نے جو دلائل دیے وہ یقیناً پوچ تھے، لیکن کچھ عرصہ سے میں نے اپنا دستورالعمل بنا رکھا ہے کہ دل پر کتنا ہی جبر کیوں نہ ہو اپنے لڑکوں کی بات مان لوں تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ نکما بڈھا نہ خود مرتا ہے نہ ہم سب کو جینے دیتا

ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ مقررہ وقت سے پہلے خودکشی بھی نہیں کرسکتا۔ پھر کیا کروں۔ یہ لڑکے کم عقل بھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ بوڑھے ذی حس نہیں ہوتے۔ بہر حال اس خط کو تلف کر دیجئے گا۔ ٹائپ شدہ ورق رکھ لیجیے گا۔ ممکن ہے سرور صاحب[1] اور اس قبیل کے لوگ کبھی میرے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کریں اور آپ یہ دستاویز پیش کرسکیں۔

مخلص

رشید صدیقی

---

[1] پروفیسر آل احمد سرور، سابق صدر شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۱۷

۲۹/۳۰ جنوری ۶۳ء
ذکاراللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تہنیت نامہ صادر ہوا۔ آپ نے بہت سی باتیں بڑے موقع اور بڑے مزے سے لکھی ہیں۔ آپ کی محبت کی باتوں سے بہت متاثر اور مسرور ہوا۔ دفعتاً زکام میں گرفتار ہو گیا۔ تمام عمر اس سے سابقہ نہیں ہوا تھا۔ اب ہوا تو اسے نہایت ناہنجار پایا۔ یوں بھی اب ہر جسمانی آزار کو آخری آزار سمجھنے کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے جو نہایت نامعقول ذہنی افتاد ہے۔ احسان ابھی یہیں ہیں لیکن جلد یا بدیر ہوگا وہی جو ہونے والا ہے۔ صرف دیر سویر کی بات ہے۔ سروری صاحب، عابد صاحب اور سرور صاحب کے مثلث متساوی الاضلاع کی عقدہ کشائی ناممکن ہے لیکن انجام ظاہر ہے اور اصل چیز تو انجام ہی ہے۔ اپنے مجلس[1] سے عہدہ برآ ہونے کا حال بڑا جامع، دل چسپ اور مختصر لکھا جو کچھ

---

[1] مجلس سے عہدہ برآ ہونے کا واقعہ میرے ذہن میں نہیں رہا۔

کیا وہ آپ ہی کر سکتے تھے:

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

شاید اقبال بھی اس طرح گوشے نہ ملا سکتے۔ اچھا خدا حافظ۔ اس وقت جتنا ہو گیا اس کو غنیمت جانیے۔

آپ کا

رشید صدیقی

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. 52224

۱۸

۲۵ر فروری ۶۳ء

ذکار اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

آج صبح احسان سے معلوم ہوا کہ سروری صاحب کشمیر میں اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ ان کو میری طرف سے دلی مبارکباد پہنچا دیجئے۔ مکان کا پتہ نہیں معلوم اس لیے براہِ راست ان کو نہ لکھ سکا۔ کل عید ہے۔ آپ دونوں کو اس کی تہنیت بھی پیش کرتا ہوں۔

آپ کا

رشید صدیقی

۱۹

۱۶ر مارچ ۶۳ء
ذکاراللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

۱۰ر مارچ کا نوازش نامہ کل ملا۔ ان دنوں اپنے یہاں کے موسم کو شاہانِ گول کنڈہ کے شب و روز سے خوب ہی co-relate کیا۔ سروری صاحب کے تقرر سے خوشی ہوئی اور زیادہ یوں کہ غیر متوقع تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ "کشمیر جھیل جائیں گے۔" ایک زندگی وہ بھی تو ہوتی ہے جہاں شاعر نے کہا ہے:

ایک ہی شب گور ہے لیکن گلوں میں ہم رہے

ذاکر صاحب سے انٹرویو کا میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے بتایا نہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی تو اطمینان ہوگیا۔ پھر بھی معمولی باتوں میں ان کے نام کو گھسیٹ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ انتخابات کا حال معلوم ہوا۔ یہ تو ہوتا رہا

ہے اور ہوتا رہے گا: باآں کساں کر یا ورد نام نداشتند!

آپ نے دلّی کی بڑھیوں کی مثال خوب لکھی۔ پورب میں بنگال کے بارے میں اسی طرح کی بات (کہی) جاتی ہے۔ فرق اتنا البتہ ہے کہ ادھر کی راوی دلّی کی بڑھیا نہیں۔ پورب میں بیوی اپنے جوان شوہر سے کہتی ہے۔

احسان اب جانے والے ہی ہیں۔ مری تنہائی کو کیا پوچھتے ہیں بس آخری تنہائی کے قریب ہوں جس کو غالبؔ نے اپنے طور پر کہا ہے: ایک مرگ ناگہانی اور ہے!

اب تو حیدرآباد کا تحفہ آپ خود رہ گئے ہیں اور آپ آنے والے ہیں! پھر کیا چاہیے؟

آپ کا
رشید صدیقی

۲۰

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
یکم مئی ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

آپ کا ۲۰ را پریل کا خط کل مل گیا۔ نظامی[۱] صاحب کی پروفیسری کے بارے میں آپ کا غائبانہ لیکن نہایت صحیح جائزہ حیرت انگیز ہے، اگر وائس چانسلر صاحب نے حسبِ معمول علم دوستی، انصاف پسندی اور دلیری سے کام نہ لیا ہوتا تو یہ اسامی ڈوب چکی تھی۔ میں آخر وقت تک بیم و رجا میں مبتلا رہا۔ اس لیے کہ جانتا تھا کہ ریشہ دوانیوں کے کتنے دروازے اور دریچے مخالفوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور نیازمندوں کا پُرسانِ حال کوئی نہیں۔ بہر حال حق، حق دار کو پہنچ گیا جس کی خوشی ہے اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ معلومہ پروفیسری کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے۔ موہوم سی ایک امید یہ بھی ہے کہ شاید موجودہ اسامی میں کچھ توسیع ہو جائے۔ دراصل بہت سے وجوہ کی بنا پر اب علی گڑھ سے طبیعت بہت اچاٹ ہے۔ مصروفیت یا تفریح کا خواہاں نہیں ہوں۔ گمنام اور گوشہ نشین ہونے کی بڑی آرزو ہے

---

[۱] پروفیسر خلیق احمد نظامی، صدر شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

طرح طرح کے منصوبے ذہن میں آتے ہیں لیکن ان کو پورا کرنے کی سبیل نہیں میسر ہے۔ لیکن رہیں کہیں آخر "کھائیں گے کیا" اب معلوم ہوتا ہے غالب کتنے بڑے شاعر تھے جہاں انھوں نے کہا ہے۔ "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"۔۔۔۔ الخ![1] میری موجودہ ذہنی کیفیت کی ترجمانی اس خوبی سے کوئی اور نہیں کر سکتا تھا جس میں خود اپنے کو بھی شامل رکھتا ہوں۔ آخر مئی سے یہاں موسم بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے کیا کیجیے گا آکے۔ بارے خیال آیا کہ انجمن ترقی اردو اور تاریخ کے ایڈیٹر ریل بورڈ سے مستعفی ہو جاؤں لیکن کائی بھرے تالاب میں ایک کنکری پھینکنے کا نتیجہ معلوم، اس لیے انگریزی کے مقولے کو پیشِ نظر کر لیتا ہوں۔ — Let things take their own course

احسان اور احسان کی والدہ اسی عشرہ میں کراچی پہنچ جائیں گے انشاء اللہ، دونوں پا بہ رکاب ہیں۔

(جگہ کی تنگی کی وجہ سے دستخط ندارد)

---

[1] اصل میں نقطہ اسی طرح

۲۱

۱۰ر جون ۶۳ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

خیال تھا کہ ہادی صاحب[۱] کی رحلت کے سلسلے میں ان کے بھائی جعفر حسن صاحب[۲] شاید علی گڑھ آئیں تو رسم تعزیت بجالاؤں گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نہیں آئے ورنہ ضرور ملنے آتے۔ مشکل یہ ہے کہ جعفر صاحب کا پتہ معلوم نہیں ورنہ براہِ راست خط لکھتا۔ اب میری طرف سے یہ آپ پورا کردیں تو شکرگزار ہوں گا اور میری اس معذوری کا بھی حال بتا دیجیے گا کہ پتہ یاد نہیں رہا تھا ورنہ براہِ راست لکھتا۔

ہادی صاحب مرحوم سے تقریباً چالیس سال سے یاد اللہ تھی، کبھی یہ بات ذہن میں بھی نہیں آئی تھی کہ مفارقت میں وہ پہل کریں گے اور میں ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ جیسے زندگی کا ایک بڑا آباد گوشہ سونا ہو گیا ہو۔

آپ کا
رشید صدیقی

احسان ۳۰ر مئی کو چلے گئے۔ تقریب غالباً محرم اور صفر کے مہینوں میں ہو۔

۱۔ پروفیسر ہادی حسن، سابق صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔ پروفیسر جعفر حسن، سابق صدر شعبۂ عمرانیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

۲۲

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۸ جون ۶۳ء

مسعود صاحب محترم، تسلیم

آپ کا ۱۳ جون کا خط کل ملا۔ جعفر صاحب کو تعزیت کا خط لکھ دیا، سوچتا ہوں غریب جان پر کیا نہ گزر رہی ہو گی جس کو مرحوم کی پیدائش سے لے کر وفات تک کی باتیں یاد آتی ہوں گی اور کس کس طرح بے تاب کرتی ہوں گی۔ اپنے بارے میں کیا کہوں کیسے کیسے بزرگوں، دوستوں اور جگر گوشوں کی مفارقت دیکھنا پڑتی ہے۔ اب اپنی مفارقت اور دیکھنی رہ گئی ہے اور وہ بھی دور نہیں معلوم ہوتی۔ ذہنی اضطراب اور جسمانی تکالیف کے اعتبار سے وہ منزل بہت قریب آ گئی ہے۔ احسان کے بارے میں آپ نے اپنے اور اس سے زیادہ میرے تاثرات کی ترجمانی کی ہے۔ جہاں تک سانحات کا تعلق ہے میری طبیعت روز بروز کچھ ایسی مریضانہ سی ہوتی جا رہی ہے کہ ہر غم بجنسہٖ تازہ رہتا ہے چاہے اس پر سالہا سال گذر چکے ہوں تازہ ہی نہیں تازہ تر ہوتا رہتا ہے۔ اب اس منزل میں ہوں جب اپنی صلیب خود ہی لیے چلنی پڑتی ہے اور ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے اس میں نہ دوسرا

ہاتھ لگانے کی فکر کرتا ہے۔ نہ ہمدردی کرتا ہے۔ زندگی اور زمانے کا یہی دستور ہے۔ کلکتہ والی کمیٹی[1] کو میں نے ہی آپ کا، ذاکر صاحب کا، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر تاراچند کا نام لکھا تھا۔ شاید ایک کوئی اور تھا جس کا نام یاد نہیں آتا۔ Judgue کے اسمائے گرامی معلوم ہوئے۔ اس سے اردو کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے۔ دعا ہے آپ خوش ہوں اور دوسرے بھی آپ سے خوش رہیں۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] اشارہ گیان پیٹھ کی اردو ایڈوائزری کمیٹی کی جانب ہے۔

۲۳

۱۱ر جولائی ۶۳ء

ذکاء اللہ روڈ

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

دعا ہے کہ آپ مع متعلقین سرور و مع الخیر ہوں۔ کل شہریار صاحب[1] کا صبح ایک دستی خط ملا اور شام خود ملنے آئے وہ اب علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں۔ فرمائش یہ ہے کہ میں کوئی مضمون لکھ دوں۔ وہ تو خیر میں نپٹ لوں گا۔ سنا ہے انھوں نے مجھ پر لکھنے کی آپ سے فرمائش کی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھ سے متعلق کچھ نہ لکھیں کسی اور موضوع پر جو چاہیں لکھ دیں۔ آپ کو تو معلوم ہے گورکھپور سے زخمی صاحب[2] جو اپنے میگزین کا نمبر میرے نام سے نکالنا چاہتے تھے اس کی میں نے کتنی مخالفت کی تھی آپ کا میرے بارے میں یونیورسٹی میگزین میں کچھ لکھنا جب وہ صورتِ حال ہو جس سے آپ واقف ہیں کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اور جس موضوع پر چاہیے ضرور لکھ کر بھیج دیجیے۔

کیسی خراب قسم کی اور کتنی شدید گرمی سے ان دنوں ہم سب کو سابقہ ہے۔

آپ کا

رشید صدیقی

۱؎ ڈاکٹر شہریار، ریڈر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲؎ پروفیسر محمود الٰہی زخمی، صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۲ اکتوبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

اس وقت نہ سروری صاحب کا پتہ یاد رہا نہ اُن کی بچّی ڈاکٹر ثمینہ[1] شوکت کا۔ دونوں کو آپ کا ضامن قرار دے کر یہ خط لکھتا ہوں۔ ضامن البتہ کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو خود امام ضامن، دوسرے عدالتی، تیسرے حقّہ کا ضامن۔ ان میں اپنا درجہ خود متعیّن کر لیجیے۔ ہمرو کے بارے میں آپ نے سروری صاحب سے بات کر لی ہوگی۔ ان کا خط آیا تھا جس میں بہت کچھ اظہارِ تکلّف کے بعد بتایا کہ زیادہ سے زیادہ اُنہے[?] جو صریحی مبالغہ ہے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ سے بات کریں گے۔ اس صنعت کا مرکز غالباً اورنگ آباد ہے، لیکن اس کے اچھے

---

[1] ڈاکٹر ثمینہ شوکت جواب حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریڈر ہیں، پروفیسر عبدالقادر سروری کی عزیز طالب علموں میں تھیں جنھیں سروری صاحب حیدرآبادی روزمرّہ کے مطابق ہمیشہ "بچّی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

نمونے حیدرآباد کے کسی اچھے امپوریم میں مل جائیں گے۔ اب شیروانی کے لیے درکار نہیں رہا۔ بلکہ خواتین ایک طرح کا اسکارف یا چادر، آسائش کی خاطر اتنا نہیں جتنا نمائش یا زیبائش کے لیے شانوں پر ڈال لیتی ہیں ویسی ہی ایک چیز درکار ہے۔ عمدہ قسم کی یہ چیز کتنے میں ملے گی؟ زرد اور کالے رنگ کے سوا، کھلتا رنگ، ڈزائن نازک اور texture عمدہ ہو، رنگ گہرا ہو تو حرج نہیں۔ اس کی کیا قیمت ہو گی مثلاً فی گز؟ جلدی بالکل نہیں ہے۔ اگر یہ چیز واقعی اورنگ آباد ہی میں سب سے اچھی ملتی ہو تو وہیں سے منگا لیجیے گا۔ پیپیتے کی پود کی زحمت نہ اٹھائیے گا۔ یہاں انتظام ہو گیا۔ ابھی نئے V.C سے نہ سابقہ ہوا نہ سامنا۔ دونوں وائس چانسلروں کو یوسف صاحب نے ۸ر کو بڑا شاندار ڈنر دیا۔ تقریباً ستر، اسی آدمی تھے۔

آپ کا

رشید صدیقی

۲۵

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۴ ار اکتوبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

میرے مطبوعہ مضامین کا وہ پلندہ جو آپ کے طالب علم[۱] یہاں سے لے گئے تھے آپ کے پاس محفوظ ہوگا۔ ان سے غالباً مقصد براری ہو چکی ہوگی۔ اس لیے اگر آپ ان کو بذریعہ ڈاک رجسٹری کرا کے بھیج دیں تو شکر گزار ہوں گا۔ ان دنوں یوسف صاحب علیل ہو گئے تھے۔ ہفتہ عشرہ صاحب فراش رہے، لیکن اب بفضلہ بہتر ہیں۔ مفوضہ فرائض انجام دینے لگے ہیں۔ گو strain زیادہ ہو جائے تو حرارت آجاتی ہے۔ یہ کمزوری کے سبب سے ہے۔

ان دنوں طبیعت میں پراگندگی اور انتشار ہے۔ نہ گھر میں جی لگتا ہے نہ باہر۔ کبھی وطن جانے کا قصد ہوتا ہے تو دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا کا مصداق ہوتا ہوں۔ بہر حال بقول اصغر: "تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی" کا سا عالم ہے۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[۱] سلطان اظہر جاوید۔

۲۶

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۹ر اکتوبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

عنایت نامہ صادر ہوا۔ جو لکھا ۱۶ر کو لکھا اور پوسٹ کیا گیا ۱۷ر کو، کوئی حرج نہیں جب آیئے تو مسودے لیتے آیئے لیکن مسودے لایئے یا نہیں، آیئے ضرور۔ ۲۷ر کو انجمن ترقی اُردو کی بھی تو میٹنگ ہے۔ آپ ممبر ہے یا نہیں۔ مولانا صاحب[1] کے بڑھاپے پر نہ جایئے "کشش کاف کرم" ان کو "پیہم دواں ہردم جواں" رکھتی ہے۔ ذاکر صاحب کے یہاں بھی ہو آئے۔ اور کبھی اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں تو خواب و خیال وعمل سب میں 'ہر پھر کے دائرے ہی میں قدم' پڑتا ہے۔ تقدیر کچھ اس طرح کی معلوم ہوتی ہے کہ علی گڑھ سے نکلا تو پھر یہاں واپس نہ آؤں گا۔ جی بھی یہی چاہتا ہے۔ عارضی طور پر اِدھر اُدھر جانا اس وقت اچھا معلوم ہوتا ہے جب مستقل قیام علی گڑھ میں ہو اور وہ قیام اچھا بھی معلوم ہوتا ہو۔ طبیعت یہاں سے اچاٹ

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی

ہوگئی ہے اس لیے نکلوں گا تو ہمیشہ کے لیے تاآنکہ "گوئید فلاں نماند" یا "رشید رفت"! یوسف صاحب بفضلہٖ اچھے ہیں۔ پنڈت جی سرسید ڈے کی تقریب میں تشریف لائے، وہ سب ہوا جو ایسے موقع پر ہوا کرتا ہے۔ یونیورسٹی میں آج سے تعطیل سرما شروع ہوگئی ہے۔ بہت سی اور باتیں لکھنا چاہتا تھا، کچھ کتابیں پڑھی تھیں ان پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا تھا لیکن کارڈ بھی ختم ہوگیا اور لکھنے سے کبھی جی اکتاگیا، اس لے فی الحال خدا حافظ۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

٢٧

ذکاء اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
یکشنبہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

۱۴ کا نوازش نامہ کل صادر ہوا۔ آج اتوار ہے۔ معلوم نہیں یہ خط آپ کو کب ملے۔ ہمرو کے مسئلے نے "سنگین شکل" ضرور اختیار کر لی لیکن فائدہ میں میں ہی رہا آپ نہ رہے! اسے آپ کے کرم پر محمول کرتا ہوں۔ نذیر صاحب دفعتہً کئی دن کے لیے باہر چلے گئے اور بتائے بغیر۔ مجھے یونیورسٹی پریس والوں کے لیے سپرد کر گئے۔ آپ کا خط آیا تو سروری صاحب کی "بچی"[1] کے مضمون کا پروف دیکھ رہا تھا۔ موصوف نے فٹ نوٹ میں جو حوالے دیے ہیں اصل میں ان کی numbering اور ہے اور proof paging میں مختلف ہو گئی ہے جیسا ہونا لازمی تھا۔ لیکن وہ کچھ اس طرح الٹ پلٹ گئے کہ دیر تک سر کھپاتا رہا چول نہ بیٹھی مجبور ہو کر کمپوزیٹر کو ہدایت لکھ دی کہ وہ اپنی عقلِ سلیم سے کام لے: ما سپر انداختیم! گو نہ میرے پاس سپر ہے نہ اس کے پاس عقلِ سلیم! احسان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر

---

[1] ڈاکٹر خینہ شوکت (دیکھیے ص، ۸۰)

کب آرہے ہیں۔ ان دنوں یہاں دس دن کی حسبِ معمول چھٹی ہے۔ آپ کے دلّی نہ آنے سے اس گردن زدنی چینی کی طرح "دل گرفتہ" ہوا جس کا ذکر اقبالؔ نے کیا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ چینی واقعی گردن زدنی ہیں۔ انفرادی طور پر تو روز دھاندلی ہوا کرتی ہے، لیکن بین الاقوامی پیمانے پر دھاندلی کرتے انھیں کو دیکھا۔ آخرکار فتح ہندوستان ہی کی ہوگی اور تمام دنیا کے ردِّعمل کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخلاقی فتح ہندوستان کے حصہ میں آگئی۔ البتہ ایک دانش مند کا قول یاد آتا ہے کہ نہ تو کسی سے اتنی دوستی بڑھاؤ کہ وہ کسی وقت دشمن ہو جائے تو پچھتاوا ہو نہ ایسی دشمنی کرو کہ دوستی ہو جائے تو شرمندگی اٹھانی پڑے! لیکن اس خاکسار سے ہندوستان اور چین دونوں عقل مند ہیں۔ اس لیے خدا حافظ کے کہنے پر عمل کرتا ہوں: گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش!

نئے V. C آگئے۔ سابق V. C چلے گئے۔ اس طرح کے انقلابات اتنے دیکھے ہیں کہ سب کو: "مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی" سمجھتا ہوں۔ سب کو سلام دعا۔

آپ کا

رشید صدیقی

رمرو کی جلدی نہیں ہے، کبھی بھیج دیجیے گا۔

۲۸

یکم نومبر ۶۳ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

گزشتہ ماہ کے آخر میں آپ کے اِدھر آنے کی توقع تھی جیسا کہ آپ نے لکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروگرام ملتوی ہو گیا۔ آج حکیم عبداللطیف صاحب کا دہلی سے خط ملا کہ ممدوح ۱۰ کو کسی کانفرنس کے سلسلے میں حیدر آباد پہنچیں گے اور آپ سے مل کر وہ مسودے (میرے منتشر مضامین کا پلندہ) ہمراہ لائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان سے کام لیا جا چکا ہوگا۔ موقع اچھا ہے، حکیم صاحب لیتے آئیں گے، پھر مجھے کسی وقت مل جائے گا امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا

رشید صدیقی

حکیم صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ۱۴ر نومبر کو واپسی ہوگی۔ غالباً آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی کوئی تقریب حیدر آباد میں ہوگی۔

رشید صدیقی

۲۹

۱۱ر دسمبر

یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

حکیم عبداللطیف صاحب[۱] دہلی سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ آپ کے یہاں گئے تو معلوم ہوا کہ آپ باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ وسط نومبر کی بات ہے، غالباً۔ تو پھر مضامین کا وہ پلندہ کیسے ملے؟ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

ظہیر علوی صاحب[۲] پر پھر قلب کا دورہ پڑا۔ ادھر محنت شاقہ کی تھی۔ اب بھی آرام سے بستر پر نہیں رہتے۔ اٹھنے کی کوشش میں پھر دورہ پڑ جاتا ہے۔ بہرحال پہلے سخت محنت کی اب بے احتیاطی کر رہے ہیں۔ حامد صاحب[۳] کا بھی دفعتاً پیرس میں انتقال ہوگیا۔ لیکن ان کی میت کی تدفین جامعہ میں ہوگئی ہے۔ یونسکو والوں نے اس کا اہتمام کیا۔ یہ بڑا غمناک حادثہ ہوا۔ کیسی کیسی یادیں مرحوم کے ساتھ وابستہ ہیں، جب جامعہ قرول باغ میں تھی۔ اللہ کی مرضی۔

ڈاک ہی سے وہ سارے مضامین بھیج دیجیے۔ ایک انتخاب میں ان سے کچھ مضامین لینے ہیں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[۱] حکیم عبداللطیف صاحب، پرنسپل طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

[۲] سید ظہیرالدین علوی، سابق استاد شعبۂ اردو اور رجسٹرار جامعۂ اردو، علی گڑھ

[۳] حامد علی خاں صاحب، سابق مینیجر مکتبہ جامعہ، دہلی۔

۳۰

۲۹ر جنوری ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۶۴ء آج صادر ہوا۔ آپ کا یہ خط جامعہ کے دفتر میں بھیج دیا ہے۔ ادیب[1] کا علوی نمبر نکالنے والے ہیں اس میں اس کو شائع کر دیا جائے گا۔ فی الحال نورالرحمٰن صاحب کو رجسٹرار مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس وقت جامعہ خاصے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ یوسف صاحب شیخ الجامعہ ہیں۔

دس بارہ دن ہوئے آپ کا ایک اور خط ملا تھا۔ اسی دن آپ کو لکھ چکا تھا اس لیے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ظفرالدین صاحب[2] ان دنوں علیل ہیں۔ اور بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ غذا بالکل نہیں ہوتی، نیند بھی نہیں آتی، پچھلی تمام تکالیف شدت پکڑ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

ان دنوں ادھر سردی کی غیر معمولی شدت رہی۔ امید ہے اب موسم بہتر ہو جائے گا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] جامعہ اُردو کا تدریسی رسالہ
[2] پروفیسر ظفرالدین صاحب، صدر شعبۂ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۳۱

۴؍فروری ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
معلوم ہوتا ہے کہ ان ذاتِ شریف[1] نے آپ کو میرے مضامین کے مسودے نہیں دیے ورنہ آپ اب تک ضرور بھیج دیتے۔ ان کے ایسا کرنے سے میرا بڑا نقصان ہوا۔ آپ کا بیچ نہ ہوتا تو مسودے دنیا ورکنار میں ان کو اتنے نزدیک بھی نہ آنے دیتا۔ ان کا نام اور پتہ بھی یاد نہیں رہا ورنہ رجسٹرار کو لکھتا شاید ان کے کہنے سے کام بن جاتا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] اشارہ سلیمان اطہر جاوید صاحب کی جانب جو رشید صاحب پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے اور جن سے اُن کے مسودات کی واپسی میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے رشید صاحب برگشتہ تھے۔

۳۲

۱۳ار فروری ۱۹۶۴ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

کیا بات ہے، ادھر کئی خطوط بھیجے کسی کا جواب نہ آیا۔ آپ تو ایسا نہ کرتے تھے۔ انھیں مضامین کی واپسی کے لیے یاد دہانی کرتا رہا جو وہ طالب علم لے گئے ہیں جن کا نام یاد نہیں رہا[1]۔ ایسا تو نہیں کہ وہ مضامین اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔ مگر یاد آتا ہے آپ نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ ان کو آپ نے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اس لیے ضائع جانے کا امکان نہیں ہے بلکہ آپ کا ارادہ بیگم صاحبہ کے ہمراہ قائم گنج بھیج دینے کا تھا وہاں سے کسی کی معرفت یہاں آجاتا، لیکن احتیاط کی خاطر آپ نے ایسا

---

[1] سلیمان اطہر جاوید صاحب جو رشید صاحب پر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ میری نگرانی میں لکھ رہے تھے اور اس غرض سے علی گڑھ بھی گئے تھے۔

نہیں کیا۔ دراصل ایک پبلشر سے طے ہوا تھا کہ ایک انتخاب اپنے مضامین کا شائع ہونے کے لیے دوں گا لیکن جب یہ مضامین نہ ملے تو وہ معاہدہ سوخت ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ واپسی کے لیے آپ کو لکھتا رہا۔ خیر یہ قصّہ تو آیا گیا ہو گیا۔ یہ تو معلوم ہو کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔

کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔ عمرالدین صاحب البتہ اِدھر زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں اور تقریباً صاحبِ فراش ہیں۔ عید کی اپنی تہنیت قبول فرمائیے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۳۴

۴؍جولائی ۶۴ء

یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

نوازش نامہ مورخہ ۲؍ آج سہ پہر میں موصول ہوا۔ اور باتوں کے علاوہ اس کی بھی خوشی ہوئی کہ دوسرے ہی دن آپ کا خط مل گیا۔ احسان کو آپ نے میرے بلانے کے سلسلے میں جو خط لکھا ہے اس کا ذکر انھوں نے مجھ سے پرسوں ہی کیا۔ جب وہ خط ان کو موصول ہوا تھا چاہتا تھا کہ اس کا جواب براہ راست آپ کو لکھوں، پھر کچھ ایسے مکروہات پیش آئے کہ لکھنے کا جی نہیں چاہا۔ ادھر کی برسات کا نقشہ جو آپ نے کھینچا ہے میرے ذہن کی فضا ویسی ہی ہو گئی تھی ایسے میں خط لکھنا گوارا نہ ہوا۔ کل اتوار ہے پرسوں لکھوں گا۔ اس کارڈ کو اپنے خط کی محض رسید سمجھیے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۳۵

۷؍جولائی ۱۹۶۳ء

یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب۔ سلام شوق

خط ملا، آپ نے برسات کا واسطہ دلا کر حیدرآباد آنے کی دعوت دی ہے کل سے یہاں بھی برسات کا کچھ اس طرح کا عالم ہے:

سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند!

کاش "مے و مشکبو" کی ناند کے بجائے چمن میں کوئی دسہری اور چونسے کی ناند بھر کر رکھ دیتا پھر دیوار پھاندنے کا بھی لطف دیکھتا۔ یہ سب اس لیے کہنا پڑا کہ مے و مشکبو کا سوال نہیں اور آم کی فصل اس سال ادھر بڑی کمزور ہوئی، سوچتا ہوں کہ اس فصل میں ملیح آباد کی دسہری اگر جنت میں پہنچا دی جائے تو سیب سے کہیں زیادہ انقلاب آفریں ثابت ہو۔ سجاد انصاری اور مہدی افادی زندہ ہوتے تو آپ نوجوانوں سے دسہری سے متعلق اس موقع پر کچھ اور بھی کہتے۔

نصاب سے متعلق جو کمیٹی آپ نے بنائی ہے اس میں مرے فائدے کی جو صورتیں نکالی ہیں ان کے لیے دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ تو ہمیشہ مرے فائدے کی باتیں سوچتے رہتے ہیں۔ کاش اس قابل ہوتا

کہ خاطر خواہ آپ کا شکریہ ہی ادا کر سکتا۔ اپنی معذوری کے سلسلے میں
بہت سے خرافات لکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی بھی سکت نہیں رہی۔ بقول
شخصے : "اے اجل کس زندگی کے واسطے!" بن پڑا تو پھر کبھی لکھوں گا۔
آنکھ میں تناؤ ہے جس سے سر میں بہت درد ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں چھوٹا
موٹا آپریشن ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا ابھی بلائیں تمام نہیں ہوئیں
اس لیے مرگ ناگہانی کا بھی متوقع نہ رہنا چاہیے۔

ہفتہ دس دن میں احسان واپس جائیں گے۔ آئے تھے تو اسی
ساعت کے خیال سے تکلیف ہوئی تھی جو برابر بڑھتی رہی۔ ممکن ہے کہ
احسان آپ کو علاحدہ لکھیں۔ بچوں کو دعا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۳۶

۷ر اگست ۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ تسلیم

کل معلوم ہوا کہ ایک غلط فہمی کا شکار ہوں جس کی اطلاع جلد سے جلد لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیج دینا چاہیے تاکہ دفتر میں آپ اطلاع دیدیں۔ پری یونیورسٹی pre-university کے اردو نصاب پر نظر ثانی کے لیے جو کمیٹی آپ کے وائس چانسلر صاحب نے مقرر فرمائی ہے اس کا ایک ممبر میں بھی ہوں۔ اس کی طرف آپ نے احسان کے ایک خط میں اشارہ کیا تھا اور میرا عندیہ دریافت کیا تھا۔ مجھے معذور رکھا جائے۔ پھر ایک مراسلہ آپ کے رجسٹرار صاحب کا آیا کہ میں اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا ہوں، شرکت منظور ہے یا نہیں۔ غلطی سے میں نے یہ سمجھا کہ یہ کوئی دوسری کمیٹی ہے اور اس میں خط و کتابت سے کام چل جائے گا، چنانچہ جواب میں عرض کر دیا کہ منظور ہے۔ کل کمال[1] سے تذکرہ آیا تو وہ اس قصہ سے واقف تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کمیٹی کا ممبر منظور ہونا قبول کیا ہے جس کے بارے میں سب سے پہلے احسان کو لکھا تھا۔ سخت شرمندہ ہوا۔ چنانچہ آج صبح پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ معذوری کا یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں کہ میں حیدرآباد نہ آ سکوں گا اور مجھے ممبری سے معذور سمجھا جائے۔

عمر الدین صاحب کی وفات سے طبیعت بڑی مغموم ہے اس وقت اتنا ہی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر کمال الدین، رشید صاحب کے بھانجے اور ریڈر شعبۂ تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۳۷

۱۴ اگست ۶۴ء

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ذکاء اللہ روڈ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

۱۱ ر و ۱۲ ر کے دونوں عنایت نامے کل شام ایک ساتھ ملے۔ عمرالدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے میری ہمت ان کو دیکھنے جانے کی نہ ہوئی باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور احسان کا بھی اصرار رہا، جس کو زندہ، ہنستا، بولتا محبت کرتا ہوا دیکھتا چلا آیا اس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔

عمرالدین صاحب سے ان کی طالب علمی کے زمانے سے آشنا رہا۔ رفیقِ باصفا تھے۔ آپ اور احسان کو تو شاید وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ظاہر کتنا کھردرا اور ناقابلِ التفات، باطن مہر و وفا سے کیسا مزین و معطر! اس سے اندازہ کر لیجیے کہ وائس چانسلر صاحب نے ان کی وفات پر اخلاص و احترام سے جتنے الفاظ جس صدقِ دل سے کہے شاید اور کے لیے کبھی کہے ہوں۔ مسعود صاحب، شاید ہر دولت لٹنے پر کسی نہ کسی طرح فراموش کی جا سکتی ہے یا ہونے لگتی ہے اس کی تلافی کی امید ہوتی ہے۔ لیکن جو دولت موت لوٹ لیتی ہے وہ کسی طرح دل سے محو نہیں ہوتی۔ عزیز و رفیق کی موت کی کوئی تلافی نہیں۔ یہ باتیں آپ کے اس مصرع سے بے اختیار دل میں

آئیں :

حیات اب نہ کبھی پائے گی سُراغِ دوست[1]

ستمبر یا اکتوبر میں حیدر آباد جانے میں آپ کا ساتھ ہو جائے تو سفر کی مہم بہت آسان ہو جائے گی۔ آپ کے سہارے چلا چلوں گا۔ اندازاً وہاں کتنے دن لگ جائیں گے اور کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مجوزہ نصاب کی ایک نقل مل جائے؟ اب رجسٹرار کو کچھ نہ لکھوں گا۔ احسان کا پتہ یہ ہے۔

آپ کا
رشید صدیقی

اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دے دیجیے گا اس سے اطمینان ہو جائے گا کہ سفر کا پروگرام عملی حالہ ہے۔

[1] مرحوم پروفیسر عزالدین کی وفات سے متاثر ہو کر چند اشعار "بیادِ دوست" کے عنوان سے لکھے تھے اور رشید صاحب کی خدمت میں بھیجے تھے یہ انھیں میں کا ایک مصرع ہے:

اندھیری رات میں یوں گُل ہوا چراغِ دوست
حیات اب نہ کبھی پائے گی سُراغِ دوست
بس ایک یاد ہا کہ روشن ہیں جس سے دیدہ و دل
مژدہ یہ ہے یہ ستارہ تو دل میں داغِ دوست

وغیرہ

۳۸

ذکاء اللہ روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۴ر ستمبر ۱۹۶۴ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

۱۲ر کا نوازش نامہ کل شام ملا۔ کوشش کرتا ہوں کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں دہلی سے رزرویشن مل جائے۔ اس حساب سے اپنے ہاں میٹنگ کی تاریخ رکھ دیجیے گا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کام ختم ہوتے ہی پہلی ٹرین سے حیدرآباد سے واپس ہونا چاہتا ہوں اس لیے کہیں بھی چائے یا کھانا یا "خیر مقدم" وغیرہ کی تقریب نہ مقرر ہونے دیجیے گا اس لیے کہ کسی میں شرکت نہ کرسکوں گا۔ اس پروگرام کو جو سنے گا ناپسند کرے گا لیکن اس معذوری کو کیا کہوں جس نے ایک مدت سے خود مجھے اپنی اوقات سے متنفر کر رکھا ہے۔ آج خورشید عالم خاں صاحب[۱] کو لکھتا ہوں کہ وہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ۴ر سے ۷ر تک کسی تاریخ میں رزرویشن کرادیں، لیکن یہ بھی دیکھوں گا کہ اگر علی گڑھ ہی سے رزرویشن کا انتظام ہو جاتا ہے تو پھر خورشید عالم صاحب کو کیوں زحمت دی جائے۔ نتیجے سے آپ کو بذریعہ تار مطلع کروں گا۔ بقیہ انشاءاللہ زبانی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[۱] بڑے داماد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

۳۹

یونیورسٹی علی گڑھ، یکم اکتوبر ۶۴ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

نامہ گرامی مورخہ ۱۸ ستمبر کل شام صادر ہوا۔ سفر کا "پرچہ ترکیب استعمال" آپ نے لکھ بھیجا، خوب کیا، دیکھیے اس کی نوبت کبھی آتی ہے یا نہیں۔ ایک صاحب کو جو رزرویشن وغیرہ کاموں سے بخوبی واقف ہیں روپے دے دیے ہیں کہ یہ مرحلہ طے کرا دیں ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔

آپ کے نواح میں طلبا اور پولیس میں "دھول دھپا" ہوتا معلوم نہیں ہوتا یا یونیورسٹی دسہرا منانے لگتی اور میں اپنی خیر مناتا گھر بیٹھا رہتا! کیا وہاں کوئی سراپا ناز یا غالب نہیں۔ طبیعت کہیں آنے جانے پر مائل نہیں ہوتی۔ کاش احباب، اعزا یا آب ودانہ اور نئے ارض و سما یہیں گھر بیٹھے میسر آجایا کرتے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۴۰

یکم اکتوبر ۶۴ء

یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

آج صبح ایک خط بھیج چکا ہوں۔ ابھی ابھی بدھ ۷ر اکتوبر کا رزرویشن موصول ہوا جس کی خبر آپ کو بذریعہ تار دے دی ہے۔ آپ فرسٹ کلاس کی ایک نچلی سیٹ شنبہ ۱۰ر اکتوبر کے لیے محفوظ کرا دیجیے۔ خدا کرے آپ ایسا کرا سکیں اور خدا کرے میں اس سے فائدہ بھی اٹھا سکوں۔ طبیعت کئی دن سے اعتدال پر نہیں اس لیے قوت ارادی پر اعتماد بھی کچھ کم ہی سا ہے۔ دعا ہے کہ آپ معہ متعلقین مسرور و مع الخیر ہوں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۴۱

۱۵ اکتوبر ۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
میرا تار اور خط ملے ہوں گے۔ اب تک تو اللہ نے ارادہ پر قائم رکھا ہے اور جب تک ایسا ہے انحراف کا کوئی امکان نہیں۔ دو باتیں عرض کرنی ہیں، ایک تو یہ کہ حتی الوسع میٹنگ ground - floor پر رکھیے گا تاکہ زینہ طے کرنے کی صعوبت نہ اٹھانی پڑے۔ دوسرے یہ کہ میں ہر موسم میں مچھر دانی استعمال کرنے کا عادی ہوں۔ یہ علی گڑھ کے بارہ ماسی مچھروں کا فیضان ہے۔ اس لیے اپنے ہمراہ مچھر دانی لاؤں گا آپ ان کے لیے (ڈنڈے) poles فراہم رکھیے گا۔
کیسے کیسے اہتمام ایک جانِ ناتواں کے لیے ہیں۔ اے وائے بر ایں جانِ ناتواں یا لعنت ایسی جانِ ناتواں پر!

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۴۲

۱۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء

یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ خدا آپ کو خوش رکھے

کل شام آپ کے مشورے کے مطابق پسنجر سے علی گڑھ پہنچ گیا۔ بہت آرام و اطمینان سے۔ تھامنی بیٹھ پر نہ صرف میری "محفوظ سیٹ" ملی بلکہ چار سیٹوں کا ایک مکمل کوپے خالی ملا۔ اس کوپے میں بیٹھ کر آرام سے کل دس بجے دن دہلی پہنچ گیا۔ ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی اور اِدھر اُدھر کی مفصل گفتگو رہی۔ اس دن حیدر آباد سے روانگی کس طرح ہوئی اس کا خیال کرتا ہوں تو عجب کیفیت ہوتی ہے اس پر پھر کبھی گفتگو ہو گی۔ سب سے زیادہ متاثر میں جاوید سلمہٗ[1] سے ہوا۔ کتنا شریف اور سنجیدہ یہ بچہ ہے۔ میں نے ایسا لڑکا اب تک نہ دیکھا تھا، اس دن ہم سب کے discomfiture پر میں نے سب سے زیادہ مغموم، لیکن مستعد جاوید کو پایا۔ کس مستعدی سے وہ ٹیکسی لانے اور سامان اِدھر اُدھر کرنے پر تیار رہتے تھے! اللہ اس کو اپنی نعمتوں سے ہمیشہ مالا مال اور والدین کی آنکھ کا تارا بنا رکھے، سکندر جاوید سے کس درجہ متاثر ہے کیا بتاؤں۔ بیگم صاحبہ کی خریدوائی چیزیں یہاں سب کو بہت پسند آئیں۔ بیوی دعا کہتی ہیں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] جاوید حسین، میرا لڑکا۔

۴۳

۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۴ء

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب

آپ کا ۱۲ر کا لفافہ کل صبح ملا جس میں آپ نے سیاست کا تراشہ بھی رکھ دیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر نذیر صاحب اور عظیم صاحب[۱] آئے۔ سرور صاحب نے آپ کو جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر نذیر صاحب خوش بھی ہوئے اور متعجب بھی۔ کچھ اس طرح کی کیفیت تھی:

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

نذیر صاحب نے اس سلسلے میں رجسٹرار صاحب سے بھی گفتگو کی جو ہر اعتبار سے قابلِ اطمینان ہے۔ بہرحال یہاں سب خوش ہیں کہ:

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

میری رائے کیا پوچھتے ہیں آپ تو میرے لیے بمنزلہ اقبال اور احسان ہیں۔ آپ کے علی گڑھ میں موجود ہونے سے مجھے جو خوشی ہو گی اور تقویت رہے گی اس کا اندازہ میرے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ آپ کو آنا ہے لیکن رائے یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی اس پروفیسر شپ کو آفر کرے۔ اس

---

[۱] پروفیسر عبدالعظیم موجودہ صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

ے علی گڑھ کی قدر دانی کے ساتھ ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی اور دوسرو
نظر میں آپ کی منزلت اور اہمیت متعین ہو گی۔ نذیر صاحب برابر دوڑ دھ
کر رہے ہیں کہ یونیورسٹی سے یہ آفر آپ کو جائے۔ سرور صاحب کو آپ
لکھ سکتے ہیں کہ باوجود چند در چند موانع کے مادرِ درسگاہ کی خواہش
سر آنکھوں پر، لیکن اپنے فرزند معنوی کو طلب کرنے کے جو آداب ہیں وہ
بھی اسے ملحوظ رکھنے پڑیں گے وغیرہ۔ کئی دن سے طبیعت اچھی نہیں
زرا سنبھل جائے تو اس سلسلے میں یوسف صاحب سے ملوں۔ سفر اور
آپ کے یہاں قیام پر آپ کو مفصل خط لکھنا چاہتا تھا لیکن طبیعت ٹھیک
نہ ہونے کے سبب سے معذور ہوں۔ انشاء اللہ دو چار دن میں لکھ
سکوں گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] یہ خط تمام تر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لسانیات کی پروفیسری سے متعلق ہے جس کے بارے میں مجھ سے سلسلہ جنبانی کی جا رہی تھی۔

۴۴

اتوار ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

آپ کے عنایت نامے کے جواب میں کل ایک خط لکھ چکا ہوں۔ آج ایگزیکٹو کونسل کی میٹنگ ہے۔ اس لیے شاید ہی یوسف صاحب سے ملاقات ہو سکے۔ موصوف آپ کی علالت کی طرف سے متردد تھے کہ ایک خط لکھنے کے بعد پھر آپ نے کچھ نہ لکھا۔ بہرحال اطمینان دلادیا گیا ہے۔ یہ کارڈ ایک خاص غرض سے لکھ رہا ہوں۔ غالباً آپ قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم کی صاحب زادی فاطمہ صاحبہ سے واقف ہوں گے جو ڈاکٹر (بی) عالم علی صاحب کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ پچھلے مہینے وہ کشمیر جاتے ہوئے ملنے آئی تھیں تو بیوی نے ان کو (۱۰۰) دیئے تھے کہ ایک حیدرآبادی پان دان اور ناگردان خرید کر بھیج دیں گی۔ موصوفہ کا پروگرام یہ تھا کہ کشمیر سے ۱۵ اکتوبر کو حیدرآباد پہنچیں گی۔ قیاس ہے کہ اب وہ حیدرآباد میں تشریف رکھتی ہوں گی۔ اہلیہ کی فرمائش ہے کہ آپ مسز فاطمہ عالم علی کو contact کریں اور ان سے روپے لاکر ایسا ہی ایک

پان دان خرید لیں جیسا کہ آپ کی بیگم صاحبہ نے میرے لیے خرید دیا تھا۔ ناگردان کی ضرورت نہیں صرف پان دان درکار ہے۔ کل معلوم ہوا کہ تاباں صاحب[۱] کے صاحبزادے میاں افتخار[۲] آپ کی خدمت میں عن قریب پہنچیں گے ان کی معرفت وہ پان دان یہاں بھیج دیجیے گا۔ مجھے امید ہے کہ بیگم مسعود ایک بار اور میرے لیے یہ زحمت گوارا فرمائیں گی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

زینت ساجدہ صاحبہ[۳] نے اپنی کچھ کتابیں دی تھیں جو میں یہاں نہ لا سکا؟ یا محض میرا خیال ہے؟

---

[۱] غلام ربانی تاباں صاحب
[۲] افتخار عالم خاں صاحب، لکچرر جرل ایجوکیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
[۳] ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ، ریڈر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

۴۵

۴ر اکتوبر ۱۹۶۴ء

ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ سلام شوق

سلیمان صاحب[1] کے مقالے کا وہ جزجو ساتھ لایا تھا واپس کرتا ہوں۔ صرف دو چار جگہ نہایت مختصر الفاظ میں بعض واقعات کی تصحیح یا اضافہ کردیا ہے۔ مقالہ نگار نے خود میرے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ ایسا کرنا غلط طریقۂ کار ہوتا۔ ایک خط مقالہ نگار کے نام[2] ان کے حوالے کردیجیے گا۔ انھوں نے اپنا تعارفی خط دیا تھا وہ کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا۔ معلوم نہیں نام بھی ٹھیک یاد ہے یا نہیں۔

فرحت میموریل فنڈ کے بارے میں میرے خط کے جواب میں سرور صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بجنسہٖ ارسال ہے۔ سجاد مرزا صاحب کی خدمت میں پیش کردیجیے گا۔ سرور صاحب مزید جو کچھ کہیں گے یا کریں گے اس کی تعمیل کروں گا۔ امید ہے کہ یہ کام بغیر کسی زحمت کے روبراہ ہوجائے گا۔

---

[1] سلیمان اطہر جاوید صاحب

[2] رشید صاحب کا حاشیہ میں اضافہ "مل گیا"

معلوم نہیں میرا وہ خط آپ کو ملا یا نہیں جس میں بیگم فاطمہ عالم علی صاحبہ (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صاحب زادی) کے بارے میں عرض کیا تھا کہ میری بیوی نے ان کو ایک عدد حیدرآبادی پاندان خریدنے کے لیے پچپن روپے دیے تھے جب موصوفہ اوائل ماہ گذشتہ میں کشمیر جاتی ہوئی علی گڑھ ٹھہر گئی تھیں۔ تاباں صاحب کے صاحبزادے میاں افتخار حیدرآباد پہنچے ہوں گے ان کی معرفت وہ پان دان (بغیر ناگردان کے) بھیج دیا جائے یا بیگم مسعودہ روپے لے کر خود ویسا ہی پان دان خرید کر بھجوا دیں جیسا موصوفہ نے میرے لیے خرید دیا تھا۔ بیگم فاطمہ کا پتہ نہیں معلوم ورنہ ان کو "راست" لکھتا۔

شیخ نیازی[1] کا ایک نسخہ ملفوف ہے اسے قتیل صاحب[2] کی خدمت میں ہدیتہً میری طرف سے پیش فرما دیجیے۔ پری pre یونیورسٹی کے مجوزہ نصاب میں وہ اس کتاب کی کوئی تلخیص یا اقتباس اپنی صوابدید سے بقدرِ ضرورت رکھ دیں گے۔ امید ہے موصوف یہ بیگار میرے لیے "شاد یا ناشاد" گوارا فرمائیں گے۔ مجوزہ نصاب کے ساتھ اس تحریر کا مسودہ بھی بھیج دیجیے گا جس میں میری طرف سے اس کا اقرار ہوگا کہ "شیخ نیازی" سے جو حصہ شامل نصاب ہے وہ ہدیتہً عثمانیہ یونیورسٹی کی نذر ہے اور اس کا معاوضہ وصول کرنے کا آج یا آئندہ نہ مجھے کوئی حق ہوگا نہ میرے اعزا کو

---

[1] رشید صاحب کی تصنیف جس میں ان کے تیسرے صاجزادے نیازی رشید کا بچپن کا مزاحیہ حال ہے۔

[2] ڈاکٹر حفیظ قتیل جو اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔

(یا جو کچھ مضمون ہونا ہو) اس دستاویز پر دستخط کرکے بھیج دوں گا تاکہ "شامل مثل" رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔"

بیگم زینت ساجدہ اور بیگم رفیعہ صاحبہ[1] (موخرالذکر کا نام صحیح ہے یا نہیں؟) نے میری تواضع و تکریم میں جس لطف و کرم سے کام لیا اور اول الذکر نے بالخصوص جیسی زحمت اور زیر باری اٹھائی اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آئندہ کبھی حیدر آباد جانے کا مسئلہ سامنے آیا تو بڑی رکاوٹ اس احساس سے ہوگی کہ حیدر آباد کے احباب اور عزیزوں کی مہربانی و مہمان نوازی کی یہ "جانِ ناتواں" متحمل بھی ہوگی یا نہیں! کئی دن سے یوسف صاحب سے ملنے کے پھیر میں ہوں ملاقات نہیں ہو پاتی۔ آپ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ نذیر صاحب کی تگ و دو کا نتیجہ نہیں معلوم ہوا۔ یوسف صاحب کی بیگم صاحبہ کی علالت کا سلسلہ جاری ہے۔ ان دنوں آگرہ لے جاکر دکھانے کی فکر ہے۔ اس طویل اور ہنوز قابو میں نہ آنے والی بیماری سے یوسف صاحب خاصے فکرمند ہیں۔ یونیورسٹی کے آلام اوپر سے! کل آپ کا خط ملا جس پر کوئی تاریخ نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ ۲۳ر کا چلا ہوگا۔ آپ نے اپنے یہاں آنے کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ مناسب ہیں۔ جہاں تک مسلم یونیورسٹی سے تعلق تھا آپ "جام و سبو" توڑ چکے۔ اب تو آپ کے نیلے آسمان سے بادۂ گلفام" کے علاوہ کچھ اور برسے تو آپ اپنے رویے پر نظرِ ثانی کریں گے۔ اس وقت معلوم کیوں اور کیسے ایک آوارہ شعر ذہن کے دام میں آگیا سرور صاحب غور فرمائیں!

اظہارِ حسرت و غم اب کیوں مری لحد پر گو اب نہیں ہوں لیکن پہلے تو تھا کبھی میں

---

[1] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر اردو، عثمانیہ یونیورسٹی۔

ممکن ہے اس گرفتاری میں کہیں کہیں سے شعر کے پرویال کی شکست و ریخت ہو گئی ہو، آپ ٹھیک کر لیجیے گا۔

روس کی حالیہ اکھاڑ پچھاڑ کے مقابلے میں آپ نے جو مثال (حال ہی کی) انگلستان کی دی اس سے کتنی باتیں تازہ ہو گئیں جن کو یادوں کے کباڑ خانے میں پھینک چکا تھا۔ گذشتہ نصف صدی میں کموزم (نجات موعودہ) کے نام سے کیا کیا نہ ہوا۔ کون نہیں جانتا۔ لیکن بقول غالبؔ ؎ بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی! اکثر یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ "آج ہمہ آفاق پُراز فتنہ و شر می بینم"، کا جو سماں نظر آرہا ہے کیا عجب کہ اس کا بڑا سبب وہ عمل ردِّ عمل ہو جو روس کا لایا ہوا ہے۔ اقدار کی یکسر اور یک بیک جو شکست و ریخت روس میں ہوئی ہے اس سے ساری دنیا کے اخلاقی بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ معاشرے میں بدچلنی اور برائی کی کیسی قیامت برپا ہے۔ روس ایک طرح کا پریشر بلٹ بن گیا ہے جس کی وجہ سے سارا فضائی نظام درہم برہم ہوتا رہتا ہے۔ یہ کیسی بدبخت حکومت اور مظلوم قوم ہے جہاں دوست اور عزیز پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ قہرِ الٰہی اور کسے کہتے ہیں۔

آپ کے جاوید کے ساتھ اقبالؔ کے جاوید کا کبھی کبھی خیال آتا ہے۔ اقبالؔ کے جسمانی جاوید جا ہے جیسے ہوں۔ ان کے یعنی جاوید تو آپ کے جاوید ہیں "قبیلے کی آنکھ کا تارا" خدا میری پیشین گوئی کی لاج رکھے۔ آمین۔

ذرا ان صاحب کا پتہ لکھیے گا جو حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن کے انچارج ہیں[1]

---

[1] پورا نام یاد نہیں رہا "فاروقی" نام کا آخری جزو تھا۔ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پر اردو پروگرام کے انچارج تھے اور رشید صاحب کے ایک پرانے شاگرد۔

اسٹیشن پر مجھے رخصت کرنے بھی آئے تھے۔ علی گڑھ ہی کے پڑھے ہوئے ہیں اور مقامات پر بھی ان سے ملاقات ہوئی رہتی مثلاً رات کی دعوت پر ڈاکٹر رفیع کے مکان پر۔ غالباً فاروقی ان کے نام کا جزو ہے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ آپ کی عدم موجودگی میں حیدر آباد کے اسٹیشن پر ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

اللہ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۴۶

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
شنبہ ۱۰ رنومبر ۶۴ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

۶ رنومبر کا گرامی نامہ آج ملا۔ حیدر آباد کے ڈاکخانے کی مہر حسبِ معمول پڑھی نہیں جاتی ۔ پان دان کئی دن ہوئے مل گیا اور توقع سے بہت اچھا۔ یوسف صاحب، نذیر صاحب، نظامی صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ آپ کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی۔ آپ کے دوستوں اور بزرگوں کی تو دلی تمنا ہے کہ آپ یہاں آئیں لیکن ہر قیمت پر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ قیمت پر۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں ہم سب کے اختیار میں تو صرف دعا ہے، دوا اور قیمت دونوں دوسروں کے اختیار میں ہے۔

موسم اچھا ہو تو اور نہ اچھا ہو تو اسی طرح صحت بہتر ہو یا بدتر!

بادِ یارِ مہرباں آید ہمی

بیگم صاحبہ، جاوید اور بچوں سب کو دعا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

کہیں کے ڈاکخانے کی مہر شاید ہی کبھی صاف پڑھی جاسکتی ہو۔ آپکے یہاں کے ایک امتحان کا آفر کل ۹ رکو موصول ہوا جس میں لکھا ہے کہ دواکو پرچے بھیج دو۔ خط پر ۲۷ راکتوبر اور ۲ رنومبر کی تاریخ درج ہے۔

۴۷

جمعہ ۲۷ر نومبر ۶۴ء

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ادھر عرصے سے یوسف صاحب سے ملاقات ہوئی نہ ڈاکٹر نذیر صاحب سے۔ پچھلی بار اول الذکر سے ملا تھا اس کی روداد آپ کو لکھ بھیجی تھی۔ ان دنوں مختلف ملاء اعلیٰ میں کچھ دامن اور گریباں کی آویزش پیدا ہو گئی ہے:

"خدا شرمائے ہاتھوں کو"

تعطیل سرمایہ میں ادھر کا قصد ہے یا نہیں، یہ بھی تو نہیں معلوم کہ وہاں اس قسم کی کوئی تعطیل ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر عمر خاں صاحب[1] کا ایک خط آیا تھا جس میں بڑی سچائی اور فخر سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ پڑھ کر جی خوش ہوا، نوجوانوں کے دلوں کو اس طرح گرم و گداز رکھنا بڑی نعمت ہے۔ یاد آتا ہے کچھ دن ہوئے آپ کی یونیورسٹی کے امتحان کا پرچہ بنانے کا ذکر آیا تھا پھر کچھ نہ معلوم ہوا کہ اس کا کیا رہا۔ اخبار (Statesman) دیکھا ہوگا ایک کالم نگار کی مسلم یونیورسٹی سے متعلق گل فشانی اور ہارون خاں شروانی کا جواب، چھاگلا صاحب کی بارگاہ میں علی گڑھ اور بنارس یونیورسٹیوں سے ہندو و مسلم کا "سابقہ" نکال دینے کا مسئلہ درپیش ہے۔ بقول غالب:

مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر غلام عمر خاں، ریڈر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی۔

۴۸

شنبہ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم ۔ سلام شوق

۴ کا گرامی نامہ کل شام صادر ہوا ۔ pre - Ph. D. کا پرچہ بھیجے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے اب تک کوئی مقالہ یا اس قسم کی کوئی اور خبر نہ آئی، تو خیال آیا آپ سے دریافت کر لوں ممکن ہے کوئی امیدوار شریک امتحان نہ ہوا ہو۔ pre-university کے اُردو نصاب کا کام جس طرح ہو، جب تک ہو رہا ہے مجھے کوئی فکر نہیں۔ آپ نے تو ساری باتیں بڑی تفصیل سے لکھ ڈالیں جن کی ایسی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آپ مجھے اپنے بورڈ آف اسٹڈیز میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجیے۔ مجھ سے کیوں دریافت کیجیے۔ آپ اور آپ کے رفقار کار مجھ سے جو چاہیں گے وہ انشاء اللہ حتی الوسع کروں گا
تو پھر آپ دسمبر میں رات کو "آگ تاپنے" اور دن میں "دھوپ کھانے" علی گڑھ تشریف نہ لاسکیں گے۔

کاش ایسے میں "گریۂ نیم شبی و نالۂ سحری" کے لیے میں ہی حیدرآباد آسکتا، لیکن یہاں کا رساول کھانے کے بجائے وہاں کا کھٹا کھانے کیوں آئے۔ مگر کیا کیجیے جی یہی چاہتا ہے کہ آپ آسکتے۔ اپنی مرضی اور دوسروں کے خرچے سے۔ خدا کرے "یوں بھی" ایسا ہو سکے اور "ووں بھی"

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۴۹

۴ مئی ۱۹۶۵ء

یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

عنایت نامہ ملا۔ علی گڑھ کے حادثہ[1] کو آج ایک ماہ ہونے کو ہے لیکن اس کا اثر کچھ اس طرح کا ہے جیسے وہ سانحہ گذر نہ چکا ہو بلکہ بعنوانِ دیگر برابر پیش آرہا ہو۔ معلوم نہیں اب اپنی زندگی میں اس کا ختم ہونا کبھی دیکھ پاؤں گا یا نہیں۔ ہارون خاں صاحب سے آپ نے جو کچھ سنا وہ صحیح ہے لیکن طبیعت کا کچھ ایسا حال ہے کہ اس پر نہ تو تفصیل سے گفتگو کر سکتا ہوں نہ جی چاہتا ہے۔ آپ نے جس دکھ اور درد سے اس قصے کو چھیڑا ہے اس کا ایک فائدہ یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ جلد ہی اس پر آپ سے گفتگو کروں گا۔ اب تک سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جس الم میں مبتلا ہوں اس کا اظہار کس کے سامنے کروں۔

معاوضے کی اطلاع آپ کی یونیورسٹی نے کچھ دن ہوئے دی تھی، پھر کچھ نہیں ہوا۔ یونیورسٹی بند ہے۔ ممکن ہے پتہ صحیح نہ لکھنے سے گڑبڑ ہو۔ ڈپارٹمنٹ کے پتے سے میرے خطوط اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ سب کو دعا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] تشدد کا وہ واقعہ جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ کو زدوکوب کیا تھا۔

۵۰

۲۸ مئی ۶۵ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل آپ کے بھیجے ہوئے کاغذات پر دستخط کر کے واپس کر چکا ہوں۔ آج تفصیل سے حالات لکھنے کا ارادہ کیا جیسا کہ خط میں اشارہ کر چکا ہوں، لیکن تردد کی کچھ ایسی باتیں پیش آگئیں کہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ عجب وقت آگیا ہے کہ ہر طرف سے ہر وقت تکلیف و تردد کی باتوں کا سامنا رہنے لگا ہے۔ اللہ رحم فرمائے، اور کیا عرض کروں۔ جو بات دفعتاً پیش آگئی ہے وہ نجی ہے۔ ادارے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سب کو دعا

آپ کا
رشید احمد صدیقی

گذشتہ سال پی۔ایچ۔ڈی (ابتدائی) کا ایک پرچہ بنا کر بھیجا تھا جس کی ایک کاپی بھی آگئی تھی۔ ایسا ہی ایک پرچہ اس سال بھی بنا کر بھیجا لیکن پھر کچھ نہ معلوم کہ کیا ہوا۔

۵۱

شنبہ، ۱۵؍جون ۱۹۶۵ء
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
آپ کے پچھلے خط کی رسید تو پہلے بھیج چکا ہوں لیکن اس میں آپ نے جن اور باتوں کا ذکر کیا تھا ان کا جواب نہ دے سکا۔ گفتگو جس اطمینان سے کرنا چاہتا تھا وہ اب تک نصیب نہیں ایک طور پر مدتوں سے نہیں اور اب کیا نصیب ہوگا۔

"سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا"

کاش یہ سفینہ غالب کا نہیں محمد بن قاسم کا ہوتا۔ لیکن مایوسی کا محل نہیں۔ محمد بن قاسم کا سفینہ ہمیشہ سے آپ نوجوانوں کا حصہ رہا ہے۔ آپ کا تو نہیں، تو جاوید کے حصے میں آئے گا۔ اللہ ان کو اس کا حق ادا کرنے کا موقع، حوصلہ اور خوشی دے آمین۔ بایں ہمہ آپ کے خط کا مفصل جواب ضرور دوں گا۔ بشرطیکہ زندہ رہا اور تھوڑا زندہ دل بھی۔

آپ کی یونیورسٹی کا خط آیا کہ پانسو روپے کے چک کی رسید بھیج دو۔ رسید بھیجے ہوئے تو عرصہ ہوا۔ آپ نے سب کچھ مکمل کر کے بھیج دیا تھا میں نے دستخط کر کے وہ کاغذات آپ کے نام پوسٹ کر دیے۔ پچھلے سال pre - Ph. D. کا پرچہ بنایا تھا اور ایک کاپی بھی جانچی تھی اس کا کیا رہا۔ سب کو دعا

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۵۲

جمعہ ۱۵ر جولائی ۶۱ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

گرامی نامہ مورخہ ۱۱ر کل ۱۴ر کو موصول ہوا۔ پروفیسر نجیب اشرف صاحب کا کارڈ بھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ان دنوں وطن گئے ہوئے تھے کل اتفاقاً راستے میں ملاقات ہوگئی تو وعدہ کیا کہ شام کو گھر آئیں گے۔ نہ آسکے۔ گھر آیا تو آپ کا خط ملا۔ آج صبح آپ کا خط اپنی تحریر کے ساتھ بھیجا اور ساری صورت حال عرض کردی۔ جواب کا بھی خواستگار ہوا جواب تک نہیں آیا۔ ممکن ہے شام کو تشریف لائیں تو گفتگو ہو۔ بذات خود میں بہت شرمندہ ہوں کہ اس viva کے سلسلے میں آپ کو کس عذاب میں مبتلا کردیا۔ کچھ دن ہوئے ضیاء صاحب کی فرمائش موصول ہوئی کہ طالب علم علی گڑھ بلا لیے جائیں!! آج شام کو نذیر صاحب سے جو طے ہوگا وہ عرض کروں گا، لیکن میری وہی رائے ہے جو پہلے تھی یعنی عثمانیہ یونیورسٹی کوئی تاریخ مقرر کردیتی آپ واپسی

لہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

واپسی کا (اسی دن کا) رزرویشن کرادیتے۔ دہلی سے رزرویشن صرف روانگی کا ہو سکتا ہے واپسی کا نہیں اور آسانی سے شارٹ نوٹس پر ہو جاتا ہے۔ اب ایک دقت یہ بھی ہے کہ چوں کہ سید صاحب وہاں پہنچ چکے ہیں اس لیے نہ کسی طرح موصوف کی موجودگی میں ہم سب کو پہنچنا چاہیے۔ دیکھیے ہم تینوں کیسے متفق ہوتے ہیں لیکن آپ میرے اس خط کا انتظار فرمائیں جو نذیر صاحب سے مل کر کل بھیج سکوں گا۔ انشاءاللہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۵۳

شنبہ ۱۶؍جولائی ۶۶ء
ذکاراللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
آپ کے خط کی رسید کل بھیج چکا ہوں۔ کل شام ڈاکٹر نذیر صاحب سے گفتگو آئی۔ طے یہ ہوا کہ ۲۵؍جولائی سے ۲۱؍ تک جو تاریخ آپ مناسب خیال فرمائیں مقرر کردیں۔ نذیر صاحب ۱۸؍ سے ۲۵ تک اپنے ہاں کے کسی VIVA میں پھنسے ہوئے ہیں کیوں کہ کوئی تاریخ متعین نہیں ہوئی ہے بلکہ باہر کے ممتحن کے اوپر منحصر ہے۔ دہلی سے نشستیں آسانی سے رزرویشن کرائی جاسکتی ہیں۔ دقت حیدرآباد سے محفوظ کرانے میں ہوگی۔ جیسا کہ آپ نے اکثر فرمایا ہے کہ کم سے کم ۲۰ دن کا نوٹس دینا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں اور نذیر صاحب دونوں حیدرآباد پہنچیں گے اسی روز شب کی گاڑی سے واپس آئیں گے۔ VIVA کا بندوبست اس لحاظ سے فرمایا جائے۔ تیسرے یہ کہ یونیورسٹی بذریعہ تار ہم کو مطلع کردے کہ فلاں تاریخ مقرر کردی گئی ہے تاکہ اسی حساب سے ہم دہلی سے نشستیں محفوظ کرا سکیں۔ پانچویں یہ کہ حیدرآباد سے ہماری واپسی کا ٹکٹ آگرہ تک کا ہو تاکہ وہاں سے

بذریعہ بس ہم آسانی سے ۱۱ بجے دن تک علی گڑھ پہنچ جائیں۔ دہلی تک پہنچنے
اور شام کی گاڑی سے علی گڑھ واپس آئے ہیں بڑی طوالت، زحمت
اور زیر باری ہے۔ چھٹے یہ کہ پروفیسر ضیاءاحمد صاحب کا ممکن ہے حیدرآباد
کا پروگرام کچھ اور ہو یعنی کچھ دن پہلے حیدرآباد پہنچنا چاہیں یا مزید چند
یوم قیام کریں یا سفر کے لیے کوئی اور کلاس پسند کریں وغیرہ۔ اس لیے
یونیورسٹی ان سے علاحدہ خط وکتابت کرے۔ آپ کی یونیورسٹی سے اب
تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔ اس خط کی رسید سے ضرور مطلع فرمایئے
تاکہ معلوم ہو جائے کہ کیا کارروائی ہو رہی ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۵۴

جمعہ ۲۳ جولائی ۶۶ء

ذکاء اللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

کل شام ڈاکٹر نذیر احمد صاحب تشریف لائے اور اپنی یہ دقت سنائی
کہ ان کی صاحبزادی جو فارسی کے ام۔ اے فائنل میں اس سال شریک تھیں
امتیاز کے ساتھ کامیاب ہو رہی تھیں ان کا نتیجہ شائع ہونے سے روک لیا
اور اس سلسلے میں یونیورسٹی تحقیق کر رہی ہے کہ کوئی بے قاعدگی تو نہیں ہوئی
نذیر صاحب یوں تو مطمئن ہیں کہ کوئی بے عنوانی نہیں ہوئی اس لیے کہ وہ
نہ ممتحن ہوئے نہ پیپر سیٹر۔ نہ ماڈریشن میں شرکت کی اور نہ viva voce میں
اور اس کی باضابطہ اطلاع وقت سے رجسٹرار کو اپنی تحریر سے دے دی
تھی، پھر بھی وہ فرماتے تھے کہ معلوم نہیں کس کس طرف سے کس کس وقت
کیا وقوعہ ظہور میں آئے۔ اس لیے وہ دو تین ہفتے علی گڑھ چھوڑنا نہیں چاہتے
آپ تو جانتے ہیں کہ وہ کتنے دنوں سے کیسی کیسی پریشانیوں میں مبتلا ہیں اس لیے
چاہتے ہیں کہ ۱۴/۱۵ اگست تک کے لیے اپنا سفر حیدرآباد ملتوی کر دیں
اس طور پر اب میرا اور ان کا ساتھ ان ہفتوں میں نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی
نزاکت نہ ہو تو ۱۵ اگست تک میرا viva بھی ملتوی فرما دیجیے ورنہ کوئی تامل
نہیں، آپ جب فرمائیں حاضر ہو جاؤں گا۔ اطلاعاً عرض ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۵۵

علی گڑھ

۲۲ر جولائی ۶۶ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

کل ایک عریضہ بھیج چکا ہوں۔ رات کنٹرولر کے دو تار آئے viva کے لیے ۲۹ر جولائی کی جاتی ہے۔ میں نے اسی وقت تار سے جواب دیا کہ منظور ہے۔ تار ہی سے بواپسی تصدیق کی جائے۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب[1] کو (دہلی) مطلع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر صاحب ہمراہ نہ آسکیں گے اس بارے میں کل عرض کر چکا ہوں۔ سکندر ہمراہ ہوگا۔ آپ ایسا کیجیے کہ ۲۹ر کو واپسی کا رزرویشن مل جائے۔ یہاں یوسف صاحب سے عرض کیا ہے کہ ۲۷ر کو ایک سیٹ محفوظ کرادیں۔ دہلی کا مرحلہ تو آسان ہے۔ دشواری آپ کے ہاں کی ہے۔ نہ صحت معتدل نہ موڈ بہتر۔ اس لیے جلد سے جلد واپس آنا چاہتا ہوں۔ دید باز دید۔ تواضع، تقریر سب سے محفوظ رکھیے، اس لیے اور چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد واپسی ہو۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، سابق صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے۔

٥٦

٢٦ر جولائی ۶۶ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

آپ کی یونیورسٹی سے ٢٢ر کو تار ملا کہ ٢٩ر تاریخ امتحان کے لیے
قابلِ قبول ہو تو اطلاع دو تاکہ دوسرے ممتحنوں کو اطلاع دی جا
٢٢ر ہی کو میں نے تار جواب دیا کہ ٢٩ر منظور ہے براہِ کرم تاریخ
کر دی جائے اس کا کوئی جواب کل تک نہیں آیا۔ آج صبح پھر اسی
مضمون کا تار ملا جو ٢٢ر کو ملا تھا کہ ٢٩ر موزوں ہو تو بذریعہ تار مطلع
تاکہ ...... وغیرہ۔ یہ جوابی تار ہے اس کا مفصل جواب آج دیا ہے
٢٩ر کی منظوری تار سے دیے ہوئے آج چار دن ہوئے۔ ٢٩ر کو آ رہا ہوں
اور اس کی اطلاع آپ کو دے دی جائے۔ ٢٧ر کو میں نے دہلی سے سیٹ
رزرو کرالی۔ آپ کی یونیورسٹی سے کوئی جواب نہ آیا تو کیا کرتا آپ کو
بھی مسلسل لکھتا رہا ہوں۔ ضیاء صاحب کے بارے میں بھی آپ کو مطلع
کرتا رہا۔ غرض یہ کہ کاروبار بڑا گڑبڑ رہا۔ اب اسی میں فائدہ دیکھتا

کر وہاں پہنچ جاؤں۔ سید نجیب اشرف صاحب موجود ہوں گے۔ امیدواروں کو بھی اطلاع دے دی گئی ہو گی۔ ممکن ہے تمام مراحل طے ہو جائیں۔ اور سب سے بڑی دقت تو اس کی ہے کہ آپ کے ہاں رزرویشن کا کیا رہا۔ اس بارے میں برابر آپ کو تکلیف دیتا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کام ختم ہو جانے پر میں اولین گاڑی سے واپس آنا چاہوں گا۔ بہر حال ۲۹ (جمعہ) کو حاضر ہو رہا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۵۷

۱۱ ؍اگست ۶۶ء

ذاکر باغ ۔ یونیورسٹی ، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا ۔ آپ نے مولانا[1] سے بعض صفات تبدیل کرنے کی جو نیک خواہش ظاہر کی ہے اس کے درست ہونے میں کیا شبہ ۔ لیکن برنارڈ شا کا مشہور لطیفہ بھی غالباً یاد ہوگا ۔ اپنے عہد کی کسی مشہور ترین حسینہ نے شا سے فرمائش کی کہ مجھ سے شادی کر لو ۔ اولاد میری طرح حسین اور تمھاری جیسی ذہین ہوگی اور یہ کتنا اچھا ہوگا ۔ شا نے جواب دیا یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تمھاری جیسی احمق اور میری جیسی ہونق ہوئی تو ؟ بہر حال میں ممدوح کی طہارت کے تصوّر اور تصویر کو جس میں دستر خوان کو آلودہ کرنے کی بھی طہارت شامل ہے اپنی کسی عادت سے بدلنے

---

[1] مولانا ضیاءالدین احمد بدایونی جنھوں نے ایک امتحان کے سلسلے میں میرے پاس رشید صاحب کے ساتھ قیام کیا تھا۔

پر آمادہ نہیں ہوں۔

جی ہاں ان دنوں آپ اس گھریلو تقریب کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں گے جس کے لیے یوسف صاحب تشریف لے گئے ہیں اللہ تعالیٰ دولھا دولھن کو اپنی بے شمار نعمتوں و برکتوں سے بہرہ مند فرمائے اور رکھے آمین۔ کبھی اس موقع پر کیا ہوتا اور کس کس طرح ہوتا آج کیا ہو رہا ہے اللہ کی مرضی۔ اس دفعہ وہاں کے قیام میں آپ سے رسماً بھی گزشتہ سانحہ کے ذکر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اللہ حافظ و ناصر رہے۔[1]

آپ کا

رشید صدیقی

---

[1] کچھ قبل برادر محترم امتیاز حسین خاں کا انتقال ہو گیا تھا اس کی جانب اشارہ ہے۔

۵۸

۳۰ مارچ ۱۹۶۷ء

ذکاراللہ روڈ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا، کیسی خوشی ہوئی کہ آپ کہا مان گئے اور بات آئی گئی ہو گئی ۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی یہی کیا[1] ۔ خدا آپ دونوں کو خوش رکھے ۔ تو پھر یہ طے ہوا کہ مرنے کے بعد جب میں خدا کے سامنے اپنے گناہوں کی جواب دہی کر رہا ہوں گا آپ دنیا میں میرا ذکر خیر کیجیے گا کیا عجب اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہو کر مجھے بخش دے! اس کے یہاں کا حساب کتاب اسی طرح کا ہے جسے گنہ گار ہی سمجھتے ہیں ۔

آپ اور آپ کی طرح دوسرے دوست اور عزیز میری جیسی عزت و محبت کرتے ہیں اس سے بے اختیار ہو کر اکثر سوچنے لگتا ہوں (اور کیسی حسرت ہوتی ہے) کہ اسے پہلے اس خوش نصیبی کا گمان ہوتا تو کتنے مناہی سے بچتا اور اوامر کو اپناتا ایسا ہوا ہوتا تو آج آپ کی محبت کا سزاوار بننے پر کتنا فخر کرتا ۔ دوستوں کے ہر کرم پر وہ فروگذاشتیں یاد آتی ہیں تو کتنا افسردہ اور شرمندہ ہوتا ہوں ۔

---

[1] یہ اس تہدید کے بارے میں ہے جو وہ اپنے مراسلات کے شائع نہ کرنے کے سلسلے میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھتے رہتے تھے اور انھیں ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی تھی۔

یہ سن کر خوش ہوا کہ لسانیات کی اسامیوں کے تقرر کے سلسلے میں آپ کے تشریف لانے کا امکان ہے۔ خدا کرے ایسا ہو اور جلد ہو۔ ذرا پہلے سے مطلع کر دیجیے گا۔ یہ اس لیے کہ آپ کا قیام میرے ہاں ہوگا۔ رہا حالیہ الکشن پر گفتگو اسے اسی وقت کے لیے ملتوی رکھیے۔ مجھے تو ذاکر صاحب کا خیال ہے کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ موجودہ set-up میں صدر جمہوریہ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے اس لیے دل نہیں چاہتا کہ ذاکر صاحب کی صحت کو ایسے فشار سے سابقہ ہو۔ صدارت کے ضمن میں ذاکر صاحب کا نام جن حلقوں سے پیش کیا اور جن اصحاب نے پیش کیا اس سے تو میرے نزدیک ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہو گئے۔ یوں چاہے جو ہو۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ ذاکر صاحب میں جو چیز آج سے ۲۵ سال پہلے میں نے دیکھ لی تھی دوسرے آج دیکھ پائے! کیوں، غلط کہتا ہوں؟

چند دن ہوئے ایک ڈائری موصول ہوئی تھی خیال آیا کہ آپ کی نذر کروں باوجود اس یقین کے کہ اس سے بہتر ڈائریاں آپ کے پاس ہوں گی اس لیے کچھ دن پس و پیش میں گزر گئے لیکن بالآخر دل یہی چاہا کہ آپ کی خدمت میں بھیج دوں۔ آپ کے نہیں تو میاں جاوید سلمہ اللہ تعالیٰ کے کام آئے گی۔

حیدرآباد کے دوستوں اور عزیزوں کو دعا و سلام شوق

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۵۹

یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۴ مئی ۱۹۶۷ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل آپ کے نوازش نامے کے جواب میں خیریت کا خط لکھ چکا ہوں۔ آپ شمس اللہ قادری مرحوم کے صاجزادے سے واقف ہوں گے جو پچھلے سال موٹر سے ہم سب کو آپکے مکان سے اپنے دولت خانے پر لے گئے اور وہاں سے اسٹیشن پہنچا آئے تھے۔ کل ان کا خط آیا، صاجزادی مس حکیمہ قادری یہاں امتحان دینے آئی ہیں ان کی خیریت دیر سے نہیں معلوم ہوئی اس لیے گھر والے پریشان ہیں۔

موصوف کا خط سکندر کو دیا کہ وومینز کالج وحیدیہ ہوسٹل جا کر پتہ لگائیں۔ صاجزادی نے میرا اور اپنے والد (قادری صاحب) دونوں کے خطوط رکھ لیے اور یہ سلپ بھیجدی جو منسلک ہے اسے موصوف کے نام بھجوا دیجیے گا۔ مشکل یہ آن پڑی کہ مجھے نہ قادری صاحب کا نام یاد رہ گیا نہ گھر کا پتہ، ورنہ براہ راست ان کو مطلع کرتا کہ صاجزادی بفضلہٖ ٹھیک ہیں تشویش نہ فرمائیں۔ لیکن یہ آپ فون پر قادری صاحب کو مطلع فرمادیں بے چارے بہت متفکر ہوں گے۔ صاجزادی نے یہ بھی فرمایا کہ انھوں نے اپنے والد کو خیریت کا (خط) لکھ دیا تھا جس کا جواب بھی آگیا!! پھر قادری صاحب کو کیوں تردد ہے؟ شکریہ

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۶۰

ذکار اللہ روڈ[1]
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
خبر گرم ہے کہ اورینٹل کانفرنس میں آپ آخر ہفتہ اکتوبر میں علی گڑھ تشریف لا رہے ہیں۔ ظاہر ہے آپ کا قیام و طعام میرے ہاں ہوگا۔ کچھ پہلے مطلع کر دیجیے گا تاکہ "بوریے" کا انتظام رہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکخانے کی مہر کے مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء کا خط ہے۔

۶۱

۲۲ر جنوری ۶۹ء شنبہ

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۲۶ر جنوری ابھی ابھی موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں کہ آپ نے کلکتہ والوں کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ ایک عرصے سے یوسف صاحب[1] کی خیریت نہیں معلوم ہوئی تھی خوش ہوں کہ آپ کے خط سے تردّد دور ہوا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ اتنے دنوں علی گڑھ رہ کر موصوف "سرد و گرم چشیدہ" ہو گئے ہوں گے۔ لیکن شملہ کی سردی سے بچنے کے لیے حیدرآباد کی پناہ لینی پڑی جہاں ہمیشہ "تفاوت نہ کند لیل و نہار" کی فضا رہتی ہے۔

لسانیات کی پروفیسری جس طرح سے بے تعلق[2] ہو گئی اس کا حال معلوم

---

[1] پروفیسر یوسف حسین خاں، سابق پرو وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جو اس وقت میرے یہاں حیدرآباد میں مقیم تھے۔

[2] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں چند سال سے لسانیات کی پروفیسری کے قیام کی تجویز تھی اس سلسلے میں ارباب حل و عقد مجھ سے گفت و شنید کر رہے تھے۔

ہوا ایک sports man نے کسی کمینے کی حرکات پر ایک موقع پر کہا تھا "میں تم کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اپنی گولی ضائع کروں۔" اسی طرح میں نہیں گوارا کر سکتا کہ اس پر لعنت کا ایک حرف زائل کروں۔ میں وہ سب کچھ کروں گا جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ اللہ مالک ہے۔ یوسف صاحب کی خدمت میں آداب۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

خانۂ مسعود میں "قران العندین" کا فقرہ خوب لکھا[۱]

---

[۱] اشارہ ہے میرے مکان پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے کے سلسلے میں رشید صاحب اور پروفیسر ضیاء الدین بدایونی کا بیک وقت مہمان ہونے کی جانب۔

۶۲

یکشنبہ ۲۰ اپریل ۶۹ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

تین چار دن ہوئے کلکتہ کے بھارتیہ جنن پیٹھ Bhartaya Jnanpith والوں نے ایک گشتی مراسلہ بھیجا ہے کہ انعام کے لیے اُردو کے کسی اہل قلم کی سفارش کی جائے۔ مطبوعہ ایک فارم ہے جس کی خانہ پُری کی جائے گی۔ آپ کو بھی یہ کاغذات ملے ہوں گے۔ میں تو یوسف صاحب کا نام پیش کرنا چاہتا تھا۔ اُردو میں ان کی تصانیف روحِ اقبال، غزل، فرانسیسی ادب اور حال کی چند مطبوعات ایسی ہیں جو اُردو ادب میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں۔ آج تک سخت سے سخت تنقید نگار نے بھی ان کی تصانیف کو مستند مانا ہے۔ سر سید، شبلی، حالی اور سید سلیمان ندوی کے بعد لیکن ان سے کسی طرح کم نہیں، یوسف صاحب کی تصانیف کا درجہ ہے۔ موصوف کی کتابوں کا مزید امتیاز یہ ہے کہ وہ موجودہ دور کے تنقیدی معیار پر بھی پوری اترتی ہیں۔ اوّل الذکر مصنفین کی تصانیف کسی حد تک مذہبی یا نیم مذہبی ہیں۔ باستثنار حالی، یوسف صاحب کی مطبوعات تمام تر علمی وادبی ہیں۔ آپ میری تجویز کو ذہن میں رکھیے گا۔ آئندہ چند دنوں میں ملاقات کی صورت نکلی تو اس پر مزید گفتگو ہو گی۔

امید ہے کہ مزاج مع الخیر اور حالات سازگار ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۶۳

شنبہ ۲۹ رجون ۱۹۶۸ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
کچھ نہیں معلوم آپ یہاں کس حال میں ہیں اور کس محفل میں ہیں۔
اس سے اندازہ کرسکتا ہوں کہ وہاں آپ پر کیا گزر رہی ہوگی!
رات دن گردش میں آسمان ہی نہیں مسلمان بھی ہیں۔ ذرا بتایئے
گا M.O.L. کے پرچے بنانے اور کاپی دیکھنے کا معاوضہ آپ کی
یونیورسٹی میں کیا مقرر ہے۔ نرخ نامے میں سارے امتحانوں کے نرخ
درج ہیں سوا M.O.L. کے۔ دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۶۴

۱۳ر جولائی ۶۰ء

ذاکر باغ یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

۱۰ر جولائی کا نوازش نامہ ملا۔ ہاتفِ شیراز بہت پہلے سے "یوسفِ گم گشتہ" کے کنعان واپس آنے کی بشارت دے رہے تھے لیکن کیا کیجیے اس قمر در عقرب" یا "اشٹ گرہ" کو (معلوم نہیں سنسکرت کا صحیح مترادف استعمال کر رہا ہوں یا نہیں، بہت دن ہوئے یہ لفظ سننے میں آیا تھا) جس کی نحوست ونجاست یونیورسٹی پر مسلط ہے۔ پرووائس چانسلر صاحب سے درخواست کی ہے کہ آپ کی خدمت میں تقرر کا اطلاع نامہ (باضابطہ) جلد سے جلد بھجوا دیں۔ تاکہ آپ یہاں پہنچنے کا انصرام بروقت اور آسانی سے کر سکیں۔ ابر و باد و باراں کی بے دریغ بخشش سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے خیر مقدم کے لیے میگھ دوت نے حیدر آباد کے موسم کو علی گڑھ منتقل کر دیا ہو۔ کچھ اور نہیں تو وہ "سبزہ زار ہائے مطرا کر ہے غضب"! نہ سہی "وہ نازنینِ بتانِ خود آرا" یا "وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے"!

۸ر کو احسان آ گئے۔ آپ بروقت آسکے تو ملاقات ہو جائے تو کیا عجب۔ سلام کہتے ہیں "نذرِ ذاکر" میں آپ کا مضمون کیوں نہیں؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ کا مضمون بھی ہوگا۔ عزیزوں کو دعا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۶۵

جامعۂ اردو، علی گڑھ
۱۲؍اگست ۱۹۶۸ء

مسعود صاحب محترم۔ آداب
۱۰؍ستمبر کو جامعہ[1] کا جلسہ تقسیم اسناد ہے۔ خطبہ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب دینے والے تھے لیکن بوجوہ نہ دے سکیں گے۔ براہِ کرم اس موقع پر ایک خطبہ پڑھ دیجیے۔ آپ کے لیے یہ جتنا آسان ہے اتنا ہی ہم سب کے لیے آپ جیسا آدمی تلاش کرنا اور پانا مشکل ہے۔ ممکن ہے کل پروفیسر ڈاکٹر سید محمد طاہر رضوی (نائب شیخ الجامعہ) نے اس کے لیے آپ سے درخواست کی ہو۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

آپ جلد لکھ لیں گے تو کوشش کی جائے گی کہ چھپ جائے ورنہ اس کے بعد شائع کیا جائے گا۔ ابھی چھپ جانا ممکن ہے۔

---

[1] جامعۂ اردو، علی گڑھ

۶۶

جامعہ اُردو، علی گڑھ

یکم ستمبر ۶۸ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

کل ایک عریضہ آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں جس میں درخواست کی ہے کہ ۸؍ کو جامعہ کا جلسہ تقسیم اسناد ہے اس میں آدھے گھنٹے ۴۵ منٹ کا خطبہ پڑھ دیجیے۔ یہ خطبہ علیم صاحب دینے والے تھے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔

اخلاقاً طاہر صاحب نے علیم صاحب سے کہہ دیا تھا کہ مسعود صاحب آپ سے مل لیں گے اور آپ جو کچھ فرمائیں گے اسے وہ (مسعود صاحب) اپنے خطبہ میں شامل کر لیں گے۔ کل طاہر صاحب سے معلوم ہوا کہ علیم صاحب نے ان سے (طاہر صاحب سے) کہا کہ "مسعود صاحب نہیں آئے"! یہ قصہ آپ کو نہ معلوم ہوگا چاہتا ہوں کہ آپ کوئی وقت نکال کر علیم صاحب سے ضرور مل لیں تاکہ جو نزاکت پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہو جائے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۶۷

۱۲ر ستمبر ۱۹۶۸ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
اس دن تقریب کی ہڑتم میں آپ کو مبارکباد نہ دے سکا۔
آتش لکھی وہ تو نے غزل عاشقانہ کیا![1]
خیال تھا جلد ہی بعد ملنے کا موقع مل سکے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔
کچھ آلامِ روزگار اکٹھا ہو گئے ہیں آپ سے مل کران کو "غم جاناں"
بنانا ہے یا اس کے برعکس۔ کب اور کیسے ایسا ہو سکے گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] وہ خطبہ جس کا تذکرہ خط نمبر ۶۶ میں ملتا ہے۔

۶۸

۱۰ ستمبر ۱۹۶۸ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔

براہِ کرم اِن اوراق پر ایک نظر ڈال لیجیے اور بتایئے کہ جس معیار کا ہونا چاہیے وہ ہے یا نہیں۔

مثلاً (۱) محض لفاظی عبارات اور طبع آزمائی تو نہیں ہے؟

(۲) کوئی ضروری بات کہنے سے تو نہیں رہ گئی۔

(۳) کوئی بے موقع اور بے ضرورت تو نہیں کہی گئی ہے

(۴) طوالت پر نہ جایئے صرف جہاں تہاں سے مناسب اقتباسات پڑھ دوں گا اور یہ عمل زیادہ سے زیادہ ۲۰۔ ۲۵ منٹ میں ختم ہو جائے گا۔ پورا خطبہ جو چاہے گا گھر جا کر اطمینان سے پڑھ لے گا۔

(۵) repetitions تو نہیں ہیں، خیالات، الفاظ اور فقروں کے۔

(۶) آپ کے نزدیک کون سے پیراگراف حذف کر دیے جائیں ان پر pencil سے نشان لگا دیجیے گا۔

(۷) آپ کا حصہ، factual حصہ کب تک ملے گا؟ اسے کہاں شامل کر دیا جائے اس کی نشان دہی کر دیجیے گا۔ مثلاً ص ۱۰ اور ۱۱ کے درمیان؟ اس وقت عجلت میں ہوں۔ اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ بقیہ بروقت ملاقات۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۶۹

۱۸ اکتوبر ۶۸ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب

کل آپ تشریف لائے بہت خوش ہوا۔ غالب پر گفتگو کرنے سے بہت سے نکتے واضح ہو گئے لیکن ان کو ضبطِ تحریر میں لانا میرے لیے آسان نہیں۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔ ذمہ داری لے لیتا ہوں۔ عزیزوں کا اصرار رد نہیں کر پاتا اس کے بعد واویلا کرنے لگتا ہوں۔

اس خط کے لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ایک بات کل سے بار بار دل میں کھٹکتی ہے کہ کل دورانِ گفتگو میں جامعہ اُردو کے محاسب دستخط کرانے آئے تو میں جلدی سے ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور کام کرنے لگا اور آپ سے معذرت چاہے بلکہ مخاطب ہوئے بغیر آپ کو رخصت کر دیا، جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ایسا سلوک تو میں معمولی سے معمولی آدمی سے بھی نہ کرتا اور نہ کرنا چاہیے۔ جب سے اب تک اپنی نادانستہ لیکن نازیبا حرکت پر نادم ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ اس یونیورسٹی میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کی عزت و محبت میرے دل میں آپ سے

سوا ہے۔ ستم یہ ہے کہ جامعہ کے محاسب کو میں نے سمجھا کہ وہ کاتب ہے جس کو میں نے اپنا مسودہ خوش خط لکھنے کو دیا تھا۔ سوچا تھا مسودہ آپ کو دکھاؤں گا وغیرہ۔

بہر حال اس واقعہ کا خیال نہ فرمایئے گا گو کچھ دنوں سے ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ اس طرح کی باتیں بغیر ارادہ مجھ سے سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔

آپ سے معافی کیا مانگوں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۷۰

منگل ۱۰/ دسمبر ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
جب کبھی دہلی جانا ہوتا ہے تو "موصوف[1]" کچھ نہ کچھ فواکہات (فتوحات) ساتھ کر دیتے ہیں بالعموم پھل یا شہد۔
میرے بعد ان تبرکات پانے کا حق آپ کو ہے چاہے موصوف سے براہِ راست ملیں یا بقول حکیم صاحب[2] میرے " through سے"۔ شہد کا یہ ڈبہ آپ کی نذر ہے۔ میٹھے میں شاید شہد ہی کو آپ کے مزاج میں زیادہ درخور ہو۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] اشارہ ہے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی جانب جو اس زمانہ میں صدر جمہوریہ ہند تھے۔
[2] حکیم عبد اللطیف صاحب۔ سابق پرنسپل طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۷۱

۲۴ر دسمبر ۱۹۶۸ء

ذکاء اللہ روڈ، ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

سلیمان اطہر جاوید کے مطبوعہ مقالے[1] پر آپ نے جو تعارف لکھا ہے وہ اتفاقیہ میری نظر سے گزرا۔ مقالے کو پڑھنے کے لیے کمال کو دے دیا تھا اس کے احسان بڑے مشتاق تھے۔ ایک خاتون کراچی جارہی تھیں، میں نے کمال سے کہا کہ مقالہ احسان کو بھیج دیں۔ انھوں نے کہا کہ مسعود صاحب نے جو تعارف لکھا ہے وہ بے نظیر ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ نے کوئی تعارف بھی لکھا ہے اب جو پڑھا تو حیرت میں رہ گیا۔ میں آپ کے مزاج اور manners سے واقف ہوں۔ آپ کسی حال میں اعتدال سے متجاوز ہو کر جذبات یا خیالات کا اظہار نہیں کرتے خواہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی جانتا تھا کہ آپ کے دل میں میرے لیے بڑی عزت و محبت ہے لیکن اس کی خبر نہ

---

[1] رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن۔ حیدرآباد ۱۹۶۸ء

تھی کہ اتنی تھی اور آپ اس کا اظہار اس موقع پر اس حد تک کریں گے۔ اس کا بھی اندازہ نہ تھا کہ اس طرح کے جذبات و خیالات کا اظہار آپ اس خوبی و اختصار سے اتنے دل کش الفاظ و عبارت میں کر سکتے ہیں۔ آپ کے اس ہنر کا معترف ہوں اور آپ کی بے پایاں ارادات و شرافت کا شکر گزار۔ اس لیے اور کہ آپ میری کمزوریوں سے واقف تھے اور ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اس طرح کی اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی بڑائیوں کے اظہار کا موقع دے۔ آمین

مخلص
رشید احمد صدیقی

۷۲

دوشنبہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

مسودہ اب تک صاف نہ کر پایا۔ ۔ ۔ [1] ۔ ۔ اس طرح گڈمڈ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ان کی کھتونی مشکل ہو گئی۔ بارے کچھ نہ کچھ ہو گیا۔ اس دن شام کی گفتگو کے پیش نظر سیرت و شخصیت کے assesment میں جو pit-falls ملتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ۴ - ۵ صفحات میں یہ تحریر فرما دیجیے کہ جدید ترین اہل فکر و نظر سیرت و شخصیت پر کن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر حکم لگاتے ہیں۔ ۲۲ - ۲۳ صفحات لکھ چکا ہوں ان میں digressions بھی ہیں جن کو یکسر موقوف کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ آخری چند اوراق سے جو کلیتہً "مبنی بر حقائق" ہوں گے ان کی تلافی ہو جائے گی۔ زندگی کیسی ہی رہی ہو خاتمہ برحق ہونا چاہیے۔ اس میں آپ کی تائید درکار ہے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] الفاظ پڑھے نہ جا سکے۔ اشارہ دہلی یونیورسٹی کے نظام توسیعی خطبہ۔ غالب کی جانب ہے جس سے رشید صاحب اس زمانے میں دست و گریباں تھے۔ مزید دیکھیے خط نمبر ۶۸

۷۳

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
نوازش نامہ ملا۔ غالب کے جن اشعار کو سامنے رکھ کر آپ نے عنایت نامہ لکھا ہے شاید خود غالب اتنا اچھا خط نہ لکھ سکتے جو بغیر اشعار کے بہت اچھے خطوط لکھتے تھے یا غالب کے خطوط میں سب سے کم اشعار ملتے ہیں جو ملتے ہیں وہ انھیں کے ہیں لیکن سب کے سب دعائیہ یا سائلانہ۔ ہزار برس سلامت رہے رہنے کا جو شعر انھوں نے بار بار لکھا ہے اور جب سے اب تک ہزار بار سے زیادہ دوسروں نے استعمال کیا ہوگا اب کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ شعر اور زندگی دونوں سے طبیعت اکتا گئی۔
آپ دروازہ کیوں کھٹکھٹائیں، چلے آیا کیجیے۔ آپ سے کس کا پردہ ہے، یہ تو میں نے آپ سے بار بار عرض کیا ہے۔
ان دنوں طبیعت متفکر رہتی ہے پاکستان میں جو ہل چل ہے اور جیسے بہیمانہ واقعات اخباروں سے روز معلوم ہوتے رہتے ہیں وہ بڑے تکلیف دہ ہیں۔ اقبال، احسان، نیازی، عذرا اور جیا سب وہیں ہیں۔ ڈاک اور تار میں بھی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ دس بارہ دن سے کسی کی خبر

معلوم نہیں ہوئی۔ نہ تار نہ خط۔ اس کے علاوہ اور مکروہات ہیں جو مدتوں سے زندگی کا جز بنے ہوئے ہیں۔ دو ایک چیزیں لکھنے کا جی چاہتا تھا وہ کر نہیں پاتا۔ اچھا نہ کر پائے۔ برے سے چھٹکارا نہ ملے۔ کیسی بے بسی اور بدنصیبی ہے۔ خاص طور پر عمر کی اس منزل میں جس میں کہ میں ہوں!

بقرعید میں "موصوف"[1] سے ملاقات نہ ہوئی وہ تشریف نہ لائے میں جا نہ سکا۔ اس لیے مجوزہ اسکیم جہاں کی تہاں رہی۔ یوں بھی اس شخص سے ملنے کا جی نہیں چاہتا جو ایسے لوگوں کو "درخور اعتنا" نہیں سمجھتا جس سے نہ کوئی امید ہو نہ اندیشہ۔ کاش آپ خود مل سکتے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا کہا مان لیا جائے گا۔ کان میں بات ڈال دینے میں کیا حرج ہے۔ آپ جو کہیں گے موصوف اسے آسانی سے نظر انداز نہ کر سکیں گے۔ ذرا طبیعت یکسو اور مطمئن ہو جائے تو آپ سے ملوں گا۔ معلوم نہیں کب آپ ڈپارٹمنٹ آجاتے ہیں اور کب آپ کے classes ہوتے ہیں۔

امید ہے اب تک آپ نے نزلہ زکام پر غلبہ پا لیا ہوگا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر عبدالعلیم۔ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب اشارہ۔

۷۴

26-3-69

علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل آپ کو خط بھیج چکا ہوں کہ تھوڑی دیر بعد ڈاکیہ آیا اور حیدرآباد کے پرچوں کا پارسل حوالے کرگیا۔ چاہتا ہوں کہ آپ اور ڈاکٹر مختارالدین صاحب جگہ، دن اور وقت طے کریں وہیں پرچے لے کر آجاؤں گا اور کام شروع کردیا جائے گا۔ جگہ سرکاری ہونا چاہیے، یعنی یا تو آپ کا شعبہ یا مختارالدین صاحب کا۔ اپنے گھر پر پرچے کھولنا، ماڈریٹ کرنا اور پھر دوسرے دن کے لیے محفوظ رکھنا (اگر کام پورا نہ ہو) مناسب نہیں سمجھتا۔ کھلنے کے بعد پرچے کسی سرکاری ہی آفس میں سربمہر رکھ دیا جائے گا۔ یہ سب اس لیے کہ رجسٹرار صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کو ان تمام امور کا تصدیق نامہ پرچوں کے ساتھ بھیجوں گا یہ خط ڈاکٹر مختارالدین صاحب کو دکھا دیجیے۔ موصوف کو علاحدہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ شکریہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۷۵

ذاکر باغ، یکم جولائی ۱۹۶۹ء
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
نوازش نامہ ملا۔ لوٹ پوٹ کر فی الحال اچھا ہو گیا ہوں۔ بیمار ہو کر اپنے پر ترس کھاتا رہا کہ کیسے عظیم الشان کام کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ اچھا ہو گیا تو محسوس ہوا کہ مر کر کیا کر لیتے، جیتے ہیں تو کیا کر لیں گے، بقول اصغر مرحوم یہ سب "فریبِ عاشقی" ہیں۔
پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب[1] کا خط میرے نام بھی آیا تھا۔ کس محبت اور عزت سے انھوں نے سنگِ بنیاد رکھنے کی فرمائش کی تھی۔ جی بھر آیا۔ کچھ دنوں سے اسی طرح کی انفعالی کیفیت کا شکار ہوں۔ کیا کرتا معذوری لکھ بھیجی۔ آپ ہی بتایئے باوجود خواہش کسی دن بھی جاوید منزل[2] تک نہیں پہنچ سکا تو حیدر آباد کیسے پہنچ جاؤں گا۔ ایک زمانہ تھا کہ ایسا آخر

---

[1] پروفیسر حبیب الرحمٰن، حیدرآباد کے اُردو کالج اور انجمن ترقی اُردو کے روحِ رواں۔

[2] غریب خانہ

آتا تو حوصلہ بڑھ جاتا کہ کیا کیا نہ کروں گا۔ آج کچھ نہیں کر پاتا۔ باوجود اس کے کہ پَر بھی کُھلا ہے اور قفس کا در بھی۔

یہ تو سب ہے لیکن باوجود بزدل ہونے کے یا اسی سبب سے ایک امرِ معلومہ میں انتقام کی آگ برابر سلگتی اور بھڑکتی رہتی ہے کاش زندگی میں یہ حساب چکایا ہوتا! سوچتا تھا کہیں سے تحفے میں قائم گنج[1] کے آموں سے بہتر آم آجاتے تو جاوید[2] اور بچیوں کے لیے بھیجتا۔ دوسرے درجہ کی چیز آپ کے لیے بھیجنا گوارا نہیں۔ خود میں نے اب تک آم نہیں چکھے۔ ان دنوں وہ عزیزانِ گرامی نہیں جن کے ساتھ آم یا کوئی اچھی چیز کھانے میں خوشی اور امتیاز محسوس کرتا تھا یعنی نہ تو کمال[3] ہیں اور نہ احسان[4]۔ غالب آم کے جیسے شائق تھے اس کا ذکر انھوں نے بڑی تفصیل سے بار بار اور شوق سے کیا ہے۔ تعجب ہے ان جیسا شراب کا اداشناس یہ نہیں محسوس کرتا تھا کہ آم کھانے میں لذتِ طلب اور کثرت ہی نہیں دیکھتے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کا لحاظ کرتے ہیں کہ آم کھانے والے ساتھی کیسے ہیں۔

---

[1] مرتب کا وطن مالوف جہاں کے آموں کی شہرت ہے۔

[2] مرتب کا بڑا لڑکا، پروفیسر جاوید حسین

[3] ڈاکٹر کمال الدین: رشید صاحب کے بھانجے، ریڈر شعبۂ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

[4] ڈاکٹر احسان رشید، رشید صاحب کے دوسرے فرزند، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

گھر میں چوری ہو گئی ایک ۲ر جون کو، دوسری کل ۳۰ر کو۔ کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا، لیکن خفت ضرور محسوس ہوئی۔ جیسے چھینکے میں کسی پکی عمر کے Don Juan (ڈان جوان) کے مصنوعی دانت گر کر کسی خاتون "پرائما ڈوما" کے آغوش میں پناہ لے۔ طبیعت موزوں رہی تو کیا عجب کسی دن آپ سے نہیں جتنا جاوید اور بچیوں سے ملنے جاوید منزل[1] تک پہنچ جاؤں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] مرتب کا مکان

۷۶

۳ر جولائی ۶۹ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

ان اوراق پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس دن غالب کے ظلم پر جو گفتگو آئی تھی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے ان کو نظام لکچرز[1] میں شامل کر دینے کا قصد ہے۔ بشرطیکہ فاروقی صاحب[2] کے اندیشہ ہائے دور دراز مانع نہ آئیں۔ میرے لیے بڑے اطمینان کا موجب ہو گا اگر آپ ان سطور کا مطالعہ بغیر کسی تکلف کے کریں گے اور کوئی بھی بات یا بحث یا اندازِ گفتگو کسی اعتبار سے کھٹکے

---

[1] شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے نظام خطبات جس کے لیے رشید صاحب نے غالب کا موضوع منتخب کیا تھا۔

[2] پروفیسر خواجہ احمد فاروقی جو اس وقت صدر شعبۂ اردو تھے اور جن کی دعوت پر رشید صاحب نے نظام خطبات کی ذمہ داری لی تھی۔

اسے قلم زد فرمادیں گے۔ باتیں پھیلا کر بیان کی گئی ہیں اس لیے اگر مختصر کر دی جائیں تو کوئی حرج واقع نہ ہوگا۔ یہ فرمائش اس بنا پر کر رہا ہوں کہ آپ علمی، ادبی اور اخلاقی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہیں لیتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جو یہ نعمت ملی ہے میں اس وقت خاص طور پر ان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

جامعۂ اردو کا دفتر جاوید منزل سے قریب ہے جواب لکھ کر آپ وہاں بھیجدیں گے تو مجھے آسانی سے مل جائے گا۔ دفتر جامعہ کو اس کی ہدایت فرمادیجیے گا۔ شکریہ

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۷۷

اتوار ۶ر جولائی ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
مسودہ[1] ملا۔ شکریہ۔ آپ نے جو مشورے دیے ہیں اور جن مصالح کی بنا پر بعض عبارتیں قلم زد کر دی ہیں (اور یہی میری خواہش اور فرمائش تھی) ان سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ سوچتا ہوں اس بحث ہی کو کیوں اٹھاؤں جس پر یہ اوراق مشتمل ہیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ غالب پر جو دو فلم تیار کیے گئے ہیں وہ بڑی اہم دستاویزیں ہیں اس اعتبار سے کہ ان سے عوام نسلاً بعد نسلٍ غالب کی سیرت و شخصیت کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہوتے رہیں گے اور وہ سب کیا دھرا اکارت جائے گا جو غالب کو بطریق شائستہ روشناس خلق کرنے کے لیے اب تک کیا جاتا رہا ہے۔

اس بنا پر ضروری ہو جاتا ہے کہ غالب شناس اپنا verdict

---

[1] غالب پر رشید صاحب کے نظامِ خطبے کا مسودہ جس کا ذکر پہلے خط میں ملتا ہے۔

ضرور دیدیں کیا معلوم اس کی تائید ملے اور ایک سنگین غلط فہمی پھیلنے سے رک جائے سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ فاروقی صاحب پر اس بحث کا ردعمل اور ان کے ہاتھوں ان اوراق کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس لیے بھیج دیتا ہوں جو کچھ ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

مومن اور خدا کی طرف آپ نے جو اشارہ کیا ہے اس کا شکریہ۔ لیکن اے وائے ایسا مومن جیسا کہ میں ہوں اور اے وائے وہ خدا جس کو آپ نے Visualize کیا ہے!!

۷۸

۲۵-۷-۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل یکے بعد دیگرے آپ کے دونوں نوازش نامے ملے۔ اس سے اطمینان ہو گیا کہ ہم دونوں ۲۹ر کو ساتھ سفر کر سکیں گے۔ شام کے قریب تار والا میرے نام تار لایا جس میں فاروقی صاحب نے پروگرام کی تصدیق کی تھی اور وقت کو ½ ۱۱ سے بڑھا کر ۱۲ کر دیا تھا جب بالعموم ایرانڈیا دہلی پہنچتا ہے۔

تار والے نے آپ کے نام کا تار دے کر پوچھا کہ یہ صاحب تو ذاکر باغ میں ملے نہیں کیا کروں؟ میں سمجھ گیا کہ یہ تار میرے تار کا مثنیٰ ہے اس لیے اپنے پاس رکھ لیا اب بھیج رہا ہوں۔

دہلی لیٹ پہنچنے کی فکر نہ کیجیے۔ امید ہے وہ انتظار کریں گے۔ ایسا اکثر ہوا ہے۔ اور علی گڑھ سے دہلی آنے والوں کے لیے یہ رعایت رکھی جاتی ہے۔ آج میں نے اسحاق[1] کو مطلع کر دیا ہے کہ ہم دونوں

---

[1] ملازم خاص ڈاکٹر ذاکر حسین۔

ایر انڈیا سے ۲۹ر کو دہلی پہنچ کر براہِ راست ٹیکسی سے یونیورسٹی چلے جائیں گے اور وہاں سے فارغ ہو کر ½۱ - ۲ بجے تک بیگم صاحبہ[1] کو سلام کرنے حاضر ہوں گے اور کھانا کھائیں گے۔ ڈی لکس کا ہم دونوں کے پاس ٹکٹ ہوگا۔ اس سے شام تک علی گڑھ واپس آجائیں گے۔ کسی اور اہتمام کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ کم سے کم میرے لیے ضروری تھا کہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضری دوں۔ کہیں اور کھانا کھانے سے بہر حال میں بیگم صاحبہ کے ہاں کھانا پسند کروں گا۔

امید ہے آپ کو یہ پروگرام پسند ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] بیگم ڈاکٹر ذاکر حسین۔

۷۹

یکشنبہ ۱۹ را کتوبر ۱۹۶۹ء

مسود صاحب مکرم۔ آداب

مضمون حاضر ہے۔ ۴۔ ۵ صفحے یا کم اور لکھوں گا۔ چاہتا ہوں کہ اسے آپ بے لاگ طور پر دیکھیں اور جہاں جس قسم کا سقم نظر آئے اسے حتی الوسع خود ٹھیک کر دیں یا مطلع فرمائیں۔ مضمون خاصا طویل ہو گیا ہے۔ آپ کو اختیار کامل ہے جہاں سے چاہیں جتنا چاہیں قلم زد کر دیں۔ معیار یہ ہونا چاہیے کہ جتنا غیر معمولی طویل ہے اتنا ہی مناسب اور معقول بھی ہے یا نہیں۔

الفاظ، فقرے، اور عبارات کو بھی بہ نظر اصلاح دیکھیے گا۔ کہیں سہو ہو یا کسی اعتبار سے متوازن نہ رہا ہو تو اُسے اپنی صواب دید کے مطابق بے تکلف درست کر دیجیے گا۔ ایک خیال ہے کہ میرا لکھا ہوا شاید کاتب سے نہ پڑھا جائے۔ اس طور پر تصحیح کا کام بڑا مشکل ہو جائے گا۔ اگر کوئی اسے خوش خط لکھ دے تو کاتب کے لیے بڑی آسانی ہو گی۔ اُجرت کا حساب بھیج دیں۔ ادا ہو جائے گا۔

میں اس مضمون کو لکھتے پڑھتے اکتا چکا ہوں۔ ایسا کیجیے کہ مجھے اب کم دیکھنا پڑے۔ مضمون کے ٹائیٹل کے بارے میں سوچ لیجیے گا۔ اس بارے میں کل کے رقعہ میں عرض کر چکا ہوں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۸۰

شنبہ ۹ راگست سنہ ۱۹۶۹ء

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم ۔ آداب

عذرا[1] نے ڈھاکے سے دو عدد چٹائیاں بھیجیں۔ ایک میرے دوسرے کوکو[2] کے لیے۔ یہ وہاں کی گھریلو صنعت ہے۔ آپ اس نواح میں رہ چکے ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے۔

اسی دوران ایک عزیز نے کیرالا کی دوہری بُنی ہوئی چٹائی تحفے میں لاکر دی۔ اس لیے ڈھاکے کی ایک چٹائی مدِ زائد میں آگئی۔ وہ آپ کے کوکو (جاوید میاں سلمہ اللہ تعالیٰ) کی نذر ہے۔ وہ چارپائی پر بچھا لیا کریں گے۔ ورنہ آپ اپنے بالاخانے پر اس کے لیے کوئی گنجائش نکال لیں گے۔ میرے نزدیک زنانے کی نشست گاہ میں گدے دار تخت پر اس کو مستقلاً ڈال رکھنا چاہیے۔ دیکھنے میں ستھری معلوم ہوگی

---

[1] عذرا رشید صدیقی۔ رشید صاحب کی دوسری صاحبزادی جن کی شادی ڈھاکے میں ہوئی تھی۔

[2] رشید صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کی عرفیت

اور بیٹھے رہنے سے اور زیادہ چکنی اور چمک دار ہو جائے گی۔ اس کے ایک طرف کھردرے حصّے پر بھی سُرخ پٹّی لگا دی جائے تو نقص دور ہو جائے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ اچھے گلاب، اچھے قالین اور چینی کے اچھے ظروف جمع کرنے کا شوق تھا۔ کراکری چوری ہو گئی، گلابوں کا شوق کمال[1] کو منتقل ہو گیا۔ قالین کے بجائے اب چٹائیاں سمیٹنے لگا ہوں۔ خانہ آرائی کے لیے دیدۂ یعقوب کی سپیدی اور کیا جلوۂ پیرِ کنعاں!

بارش بڑے مزے کی ہو رہی ہے لیکن "عقل سے شرمساری" کے دن کہاں سے لائے جائیں!

مخلص

رشید احمد صدیقی

چٹائی کو کئی دن بچھائے رکھا کہ اس کی تہیں ہموار ہو جائیں۔ کچھ تو ہوئیں کچھ آپ کے یہاں ہو جائیں گی۔

---

[1] ڈاکٹر کمال الدین۔ رشید صاحب کے بھانجے۔

۸۱

۰ار اکتوبر ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ہماری زبان کا پچھلے ہفتہ کا اداریہ[1] خوب تھا۔ ترتیب، مقدمات، عبارت اور لب ولہجہ ہر اعتبار سے مبارکباد دیتا ہوں۔ خیال تھا کہ ملاقات ہو جائے گی تو زبانی تہنیت پیش کروں گا۔

کل ڈاکٹر محمد حسن[2] کا خط آیا تھا وہ بھی اس اداریہ کے معترف ہیں۔ ام۔ او۔ ایل (M.O.L) کے پرچوں کا تکملہ ہو گیا۔ آپ نے رجسٹری اور بیمہ پر جو صرف کیا اس کا بل کتنے کا تھا۔ غالباً میرے باب میں شامل ہوگا۔ ایسا ہے تو آپ رقم بتا دیجیے میں ادا کردوں۔ مجھے میرے بل کے ساتھ وصول ہو جائے گا۔ امید ہے کام زیادہ ہوگا اور آپ بیش از بیش خوش۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء کا اداریہ "سنسکرت اصطلاحات علمیہ اور اُردو زبان" ستمبر ۱۹۶۹ء پروفیسر آل احمد سرور، سکریٹری انجمن ترقی اُردو اور ایڈیٹر ہماری زبان کے امریکہ چلے جانے کے بعد تقریباً نو ماہ کے لیے دونوں ذمہ داریاں مجھے تفویض ہوئیں۔ اگلے چند ماہ تک رشید صاحب کے جو بھی رقعات میرے پاس آتے رہے وہ ازراہِ شفقت افعل التفضیل کے صیغے میں میرے لکھے ہوئے اداریوں کے بارے میں بار بار تذکرہ کرتے رہے ہیں۔

[2] ڈاکٹر محمد حسن جو اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں ریڈر تھے۔

۸۲

۱۲؍ نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم ۔ سلام شوق

ہماری زبان میں آپ کا تازہ ترین اداریہ[1] خوب ہے ۔ جی خوش ہو گیا ۔ کتنا مختصر پُر مغز اور دل کش ۔ عبارت کیا ۔ اشارت کیا ، ادا کیا ۔ اور یہ سب ہو (linguistic) ہونے کے باوجود ۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ لنگوئسٹ ہونے کو انشا پرداز ہونے کا منافی قرار دیتے ہیں ۔ اس سے پہلے جتنے مضامین تھے وہ مبنی بر حقائق تھے ۔ یہ ہمارے تہذیبی تقاضوں (غیرت و حمیت) کا اقرار اور اعلان ہے ۔ خدا آپ کو خوش رکھے ، کار ے کردی ۔

انھوں نے زچ کر رکھا ہے ۔ اپنے مضمون[2] کے پہلے ۲۰ ۔ ۲۲ صفحے

---

[1] 'اردو ایک تہذیبی قدر اور ضرورت' (اداریہ ۸ ر نومبر ۱۹۶۹ء)

[2] رشید صاحب کے ان مضامین کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اس زمانے میں انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی "اردو ادب" کے لیے لکھے تھے جس کا میں اس زمانے میں قائم مقام مدیر تھا ۔

کی کتابت دیکھ کر واپس کر چکا ہوں۔ کل بقیہ صفحات آگئے ہیں ان کو دیکھ رہا ہوں۔ کاغذ پر پیلی دھندلی روشنائی سے لکھی ہوئی گنجان خفی تحریر کا مقابلہ میری کمزور بینائی نہیں کر پاتی لیکن نہ دیکھوں تو کتابت کی بڑی فاحش غلطیاں راہ پا جائیں۔ کل تک واپس کر دوں گا۔ ہاں سات صفحات اور لکھ لیے ہیں آپ کی نظر سے گزر جائیں تو وہ بھی کاتب کے حوالے کر دیے جائیں۔

سب سے مشکل کام اس کا خاتمہ لکھنا ہے اب تک ذہن میں نہیں ہے خدا کرے وہ بھی اطمینان سے ہو جائے۔ آپ تو انجمن کی میٹنگ کے بعد واپس آئیں گے۔ کانگریس میں جو اختلال ہے۔ دہلی کے پنڈت اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

رمضان المبارک سے قطع نظر امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۸۳

۱۴ر نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ان اوراق کو اور ملاحظہ فرما لیجیے اور کاتب کے حوالے کر دیجیے جہاں کہیں کسی قسم کا سقم نظر آئے اسے بے تکلف دور یا درست کر دیجیے۔ شکر گزار ہوں گا، اس لیے کہ یہ آپ کا احسان ہوگا۔

اب سب سے مشکل حصہ رہ گیا ہے، یعنی اس کو ختم کیسے کروں۔ ہفتہ عشرہ سے سوچ رہا ہوں کہ دو ایک صفحے اور کیسے ہو جائیں۔ پریشانی یہ ہے کہ اب تک کوئی راستہ نظر نہ آیا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۸۴

۱۸ر نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

پرسوں ہماری زبان میں آپ کا اداریہ (اُردو وسیلۂ تعلیم)[1] دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں ایسے مدلل و مسلسل مضامین سب وشتم اور جزع و فزع سے پاک اُردو کی حمایت میں کہیں اور شائع نہیں ہوئے۔ ہماری زبان ہندوستان میں بالخصوص یوپی کے تمام اُردو اخبارات کو جانا ہوگا۔ کہیں اور نہیں تو دعوت دہلی، سیاست کانپور، قومی آواز لکھنؤ، اور عزائم لکھنؤ کو ضرور بھیجیے۔ الجمعیۃ کو تو جاتا ہے۔ حیدرآباد کے اخبارات کو بھی بھیجا جائے۔

اپنے مضمون کے ۷۔ ۸ اوراق کئی دن ہوئے بھیج چکا ہوں۔ امید ہے آپ نے ایک نظر ڈال کر کتابت کے لیے دے دیا ہوگا۔ اس سے پہلے کاپیوں کی دو قسطیں تقریباً ۴۲ صفحات تصحیح کر کے براہِ راست کاتب کے پاس بھیج دی تھیں۔ انھوں نے نظرِ ثانی کے لیے نہیں

---

[1] صحیح عنوان "اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم" (اداریہ ۱۵ر نومبر ۱۹۶۹ء)

بھیجا۔ مضمون کا آخری صفحہ بھیجتا ہوں۔ اس کے پہلے حصے میں "سوئی"
لگے گی تاکہ واضح طور پر بقیہ سے علاحدہ اور نمایاں رہے۔
جیسا چاہتا تھا ویسا نہ ہوا۔ کیا کروں کیسے کیسے غیر متوقع مکروہات
پیش آجایا کرتے ہیں اور وقت عزیز اور فرصتِ مغتنم ان کی
نظر ہو جاتی ہے۔

آپ کے آفس سے متصل مہرالٰہی صاحب جنرل ایجوکیشن میں کام
کیا کرتے تھے۔ کچھ دن ہوئے سنا تھا علیل ہو گئے۔ اب کیسے
ہیں؟ عرصہ سے ان کا حال معلوم نہیں ہوا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۸۵

۲۰ر نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

کل ۱۲ بجے کے قریب میں نے اپنے مضمون کا پورا پروف (دیکھنے کے بعد) آپ کی خدمت میں ڈپارٹمنٹ بھیج دیا تھا۔ آپ کلاس لے رہے تھے اس لیے سکندر[1] چپراسی کو دے آیا تھا امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ درخواست یہ تھی کہ ایک سرسری نظر ڈال لیں گے تو اطمینان ہو جائے گا۔ آنکھوں کی تکلیف کے سبب سے میں کاپی اچھی طرح دیکھ نہیں پاتا تھا۔ دوسری بات یہ عرض کرنے کی تھی کہ پریس والے "آف پرنٹ" کا خیال اور لحاظ رکھیں۔ یعنی میرے مضمون کے کتنے نسخے مجھے مل سکیں گے۔ یہ میرے یافتنی معاوضے کے حساب آجائے گا۔ نسخے جلد مل جائیں گے تو خوش ہوں گا۔ گو ان کی release اس وقت کروں گا جب "اردو ادب" اچھی طرح شائع ہو جائے گا۔ اس کے مقررہ آداب یہی ہیں جن کو میں ملحوظ رکھوں گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ، جس کا میں اس وقت قائم مقام مدیر تھا۔ رشید صاحب کے اس زمانے کے بیشتر مضامین اسی سہ ماہی میں شائع ہوتے تھے وہ ان کی طباعت و اشاعت کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے اور مسلسل مراسلت کرتے تھے۔

۸۶

۲ر دسمبر ۱۹۶۹ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ آداب

ایک دوست ڈھاکے سے آئے ہوئے ہیں۔ عید کے فوراً بعد واپس جائیں گے چاہتا ہوں کہ کچھ آف پرنٹس ڈھاکہ اور کراچی کے عزیزوں اور دوستوں کو بھیج دوں ورنہ بھیجنے کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ اُردو ادب کا سب سے پہلا مضمون میرا ہی ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ عید سے قبل مجھے آف پرنٹس مل جائیں۔ ظاہر ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُردو ادب تمام و کمال شائع نہیں ہوا اور اس کا آف پرنٹ منظر عام پر آگیا اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان اپنی اپنی مطبوعات کے اعتبار سے اب water - tight compartments بن گئے ہیں کسی کو خبر نہ ہوگی کہ اردو ادب کس کو پہلے ملا اور کس کو بعد میں۔ آف پرنٹس کی لاگت میرے معاوضے میں وضع کی جائے گی۔ ایسا کیجیے کہ تین چوتھائی آف پرنٹس کی لاگت کے لے لیجیے اور ۱/۴ اپنے دفتر کی امانت میں دے دیجیے تاکہ میں ان کو پتے لکھ کر دے دیا کروں۔

اور وہ محصول ڈاک ادا کر کے مختلف پتوں پر بھیج دیا کریں۔ اس میں مجھے بہت سہولت ہو گی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آف پرنٹس عید سے پہلے مل جائیں۔ کوئی دقت نہ ہونی چاہیے اس لیے مضمون تمام ضروری مراحل طے کر چکا ہے اب صرف چھپنے کا مرحلہ باقی ہے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے اور میری درخواست کے مطابق ایک نظر کاپیوں پر ڈال لی ہو گی۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۰ - ۱۵ نسخے اقبال[1] کو بھی بھیج دوں گا۔ وہ بذریعہ ڈاک میرے دیے ہوئے پتوں کو کراچی اور دوسرے مقامات پر بھیج دیں گے۔

حفیظ الدین صاحب[2] کی جگہ جو صاحب انجمن کے دفتر کے انچارج ہوئے ہیں کا پورا نام کیا ہے؟

---

[1] رشید صاحب کے بڑے صاحبزادے۔ اقبال رشید صدیقی

[2] سابق اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)

۸۷

۱۴ دسمبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ آف پرنٹس کی طرف سے اطمینان ہوا۔ ذرا اس کا ضرور خیال رکھیے گا کہ عید کے دن یا اس سے قبل ہی مل جائیں ورنہ جانے والے صاحب اگر فوراً ہی عید بعد رخصت ہونے والے ہوئے تو وہ نسخے بھیجے نہ جاسکیں گے ــــــــ آج ہماری زبان کا یکم دسمبر کا شمارہ ڈاک سے موصول ہوا۔ اُردو رسم خط کے عنوان سے آپ کا اداریہ بے نظیر ہے۔ ایسے اہم اور متنازعہ فیہ مسئلہ پر اس جامعیت وقابلیت سے اتنا مختصر مضمون میری نظر سے نہیں گزرا، پھر اس کا سنجیدہ، شریفانہ اور علمی لب ولہجہ اپنے نزدیک یہ مضمون اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ اس سے آپ کی علمیت ہی نہیں شخصیت و شرافت کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ ایسی بے مثل خدمات کے لیے خدا آپ کو تا دیر صحت مند اور خوش وخرم رکھے۔ آمین

ان دنوں طبیعت خراب ہے باوجود انتہائی احتیاط کے۔ کیا کیجیے احتیاط سے کہیں ناگزیر سے نجات ہوتی ہے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۸۸

پنجشنبہ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۹ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
کل انجمن کے دفتر سے پندرہ نسخے آف پرنٹ کے مل گئے۔ آپ کے اس کرم کا شکرگزار ہوں۔ یہ نسخے مل نہ جائے تو عزیزوں اور دوستوں کو جلد اور آسانی سے نہ بھیج سکتا جس کا افسوس رہتا۔
پرسوں ہماری زبان میں آپ کا مضمون اُردو کی مرکزیت و لامرکزیت سے متعلق پڑھا۔ جب سے آپ نے یہ اداریے لکھنے شروع کیے ہیں۔ اُردو کے مرکزا مسائل پر اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ ایسے خوب صورت اسلوب اور شگفتہ عالمانہ انداز میں کسی اور کا کوئی مضمون کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ مدتوں پہلے سے بھی۔
بار بار اس طرح کے توصیفی کلمات، وہ بھی آپ کو لکھنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کا جو حق ہے وہ ہر حال میں اور ہر وسوسے اور خطرے کو نظر انداز کر کے آپ کو پہنچا دینا بہرحال اولیٰ ہے۔ خدا مبارک کرے پیشگی عید کی تہنیت بھی۔ آپ کو اور متعلقین کو بھی۔
مخلص
رشید احمد صدیقی

۸۹

۱۸ ر دسمبر ۱۹۶۹ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ہماری زبان کی ۱۵ ر دسمبر کی اشاعت میں آپ نے اداریہ[1] حسب معمول لکھا ہے۔ جب سے انجمن[2] کا کام آپ کے سپرد ہوا ہے ہماری زبان کے اداریے ہر اعتبار سے وقیع ہونے لگے ہیں۔ زیرِ بحث مسائل ایسے ہوتے ہیں جن پر عام طور سے اچھے اچھے لکھنے والے جذباتی سطح یا سطحی جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ کام کی بات کم کہتے یا کہہ پاتے ہیں۔ اس لیے ایسے مضامین کا اثر کم ہوتا ہے، ان لوگوں پر بھی جو ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آپ کی تحریر حقائق پر مبنی ہوتی ہے اور زبانوں کی ابتدا، عروج اور زوال سے متعلق جتنے لسانی، قومی، تاریخی اور تہذیبی عوامل ہوتے ہیں ان پر بھی نظر ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا اثر ایسے لوگوں پر ہوتا ہے جو اس زبان کے بولنے اور عزیز رکھنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ عناد رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر اداریے

---

[1] اداریہ "گرو گرنتھ صاحب اور اردو" (۱۵ ر دسمبر ۱۹۶۹ء)

[2] انجمن ترقی ہند (اردو) (علی گڑھ)

میں آپ نے پہلے ہی پیراگراف میں جتنی باتیں اسلام اور ہندوستت کے اتصال سے جو فکری، لسانی اور مذہبی currents and cross-currents نمودار ہوئے جن کو شاعرانہ زبان میں کہیں گے کہ جو رشتۂ موج و کنار پیدا ہوا یعنی دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من۔" پورا شعر آپ کو معلوم ہوگا یہ ہے۔

با من آویزش او الفتِ موج است کنار
دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

کا جس ایجاز و اعجاز سے اظہار کر دیا ہے وہ کسی اور سے ممکن نہ تھا۔ اس پیراگراف[1] پر تو کتنے "خطبۂ صدارت" تصنیف کیے جا سکتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ جب تک ہماری زبان آپ کی ادارت میں نکلتا ہے اسی طرح کے مسائل پر آپ وقتاً فوقتاً ایک سے ایک فکر انگیز مضامین لکھتے رہیں گے۔ اس طرح سے اُردو کے مسائل پر سوچنے کا ایک نیا اور صحت مند شعور پیدا ہوگا یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ ان مضامین کا مجموعہ ضرور شائع ہونا چاہیے[2]۔ آپ کے اداریوں کو لکھنؤ

---

[1] پیراگراف کا حوالہ دینا بھول گئے۔ غالباً مراد اس اداریے کے پہلے پیراگراف سے ہے جس میں اس تہذیبی موج و کنار کا ذکر کیا ہے جس نے رام اور رحیم اور کعبہ و کاشی کے امتیازات مٹنے لگے" تھے۔

[2] رشید صاحب کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں ان کو "اردو کا المیہ" کے نام سے جمع کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ (مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ)

کا اردو ہفت روزہ عزائم بھی شائع کرنے لگا ہے۔

کچھ نام بھیجے تھے مثلاً خورشید[1] عالم خاں، یوسف صاحب وغیرہ۔ اور درخواست کی تھی کہ ان کو ذاکر نمبر[2] بھیج دیجیے۔ نقوی[3] صاحب نے بتایا کہ وہ میرے reprints بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے عرض کیا reprints تو میرے ہیں۔ متذکرہ اصحاب کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ انجمن کی طرف سے پورا ذاکر نمبر پائیں۔ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کو بھی ایک نمبر بھیج دیجیے گا۔ ذاکر صاحب ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ڈاکٹر قدوائی بھی جان نثار کرتے تھے۔ مجھے اب تک reprints کے چالیس نسخے مل چکے ہیں۔ دس بقیہ امانت دفتر میں جمع ہیں، اس طرح مجھے کل پچاس نسخے موصول ہوئے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] بڑے داماد ڈاکٹر ذاکر حسین

[2] انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی 'اردو ادب' کا خاص نمبر۔

[3] ڈاکٹر سید نامر نقوی، اسسٹنٹ انجمن ترقی اردو (ہند)۔ علی گڑھ

۹۰

۵ر جنوری ۱۹۷۰ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ہماری زبان کے سالِ نو کا آپ کا پہلا اداریہ[1] پیش نظر ہے۔ جس جامعیت کے ساتھ زبان کے کتنے تاریخی، لسانی اور نزاعی مسائل کو آپ نے عالمانہ حقیقت پسندانہ اور دل نشیں انداز میں قلم برداشتہ قلم بند کیا ہے اسے میں اظہار و ابلاغ کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں۔ اس اداریے میں پہلا اور آخری پیراگراف حسنِ بیان اور خاتمۂ کلام میں بے مثل ہے۔ اعلیٰ انشا پردازی کا ایک بڑا مشکل اور نازک ہنر یہ ہے کہ مضمون شروع کیسے کیا جائے اور ختم کیوں کر ہو۔ اتفاق سے ہماری زبان کا ۲۲ر نومبر ۱۹۶۹ء کا اداریہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا عنوان ہے "ہندوستانی پرچار سبھا" سبھا کی وکالت آپ نے کتنی اچھی کی ہے۔ میرا مستقل خیال یہ ہے کہ آپ کے اداریوں کا آخر میں انجمن کی طرف سے ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ یہ طلبا، نیز ان لوگوں کے لیے بڑا مفید اور قیمتی مطالعہ ہوگا جو اُردو کے مسائل سے دل چسپی

---

[1] "اردو بنام ہندی"

سکتے ہیں۔ اس سے اُردو کی تائید اور وکالت کرنے والوں کا لب و لہجہ اور بات کہنے کی سطح اونچی ہو جائے گی جس کا اُردو کے حق میں بڑا اچھا اثر ہوگا۔ ان اداریوں سے ام۔ اے اُردو کے امتحانات کے لیے بڑے اچھے پرچے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح امتحانات کے پرچوں کا معیار بڑھ جائے گا۔

میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جب سے آپ نے ہماری زبان کی ادارت کا کام اپنے ذمہ لیا ہے آپ کی تحریر میں اردو سے متعلق امید و عزم کی وہ تازگی و تابناکی آگئی ہے جس کا میں ہمیشہ متمنی رہا اور آپ پس و پیش کرتے رہے۔ اکبر کا ایک شعر یاد رکھیے:

ہر چند بگولا مضطر ہے، اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے، اک وجد تو ہے، بے چین سہی برباد سہی

اسی رقص اور وجد کے طفیل "زندہ ہیں اقوام" اور یہی ہے "رازِ تب تاب ملتِ عربی" ہم آپ ملت عربی سے مستثنیٰ سہی!

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۹۱

دوشنبہ، ۱۹ر جنوری ۱۹۷۰ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

اس دفعہ آپ نے اترپردیش کے اردو پر احسانات کی قلعی خوب کھولی[1]۔ اس پر ایک واقعہ یاد آتا ہے ممکن ہے آپ نے سنا ہو۔ آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے جون پور گرد و نواح میں آتش بازی کی صنعت کے لیے مشہور تھا۔ شہر سے متصل ایک پرانا بڑا اونچا قلعہ ہے۔ فصیل سے ملا ہوا دریائے گومتی بہتا ہے۔ کرسمس کے زمانے میں صاحب کمشنر دورے پر آتے تھے۔ جون پور کے اکابر کی طرف سے قلعہ کی فصیل پر ضیافت کا انتظام ہوتا۔ حکامِ عالی شان وہاں سے دریا کے کنارے آتش بازی کا تماشا دیکھتے۔ آتش بازی ہی نہیں حکام رسی اور دوسرے بہت سے ناگفتہ بہ ہنر کے ایک فن کار تھے۔ جاڑے میں ننگ دھڑنگ مرض اور فاقے میں مبتلا آتش باز اپنی اپنی آتش بازی دکھاتے۔ حکام عالی مقام چیرز دیتے۔ فن کار صاحب

---

[1] اداریہ "اترپردیش سرکار کا اردو بورڈ" (۱۵ر جنوری ۱۹۷۰ء)

سوٹ بوٹ سے لیس آگے بڑھ کر کورنش بجالاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ نقد انعام اور سرٹیفکٹ تو یہ لے جاتے۔ آتش باز بے چارے ویسے ہی محروم گھر واپس آجاتے۔ اردو مکاتب اور مدارس کو قائم کرانے اور چلانے والوں کا انجام اس رپورٹ سے یہی معلوم ہوا۔ خدا آپ کو آبرو سے رکھے اور تندرست کہ آپ نے اس پردے کو فاش کیا۔

یہ تحفہ[۱] قبول فرمایئے۔ اس سے تندرستی میں یقیناً اضافہ ہوگا اور توانائی رہی تو آبرو پر کبھی آنچ نہ آئے گی۔ انشاء اللہ

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[۱] غالباً گلاب یا موسمی پھولوں کا عطیہ۔ جو رشید صاحب اکثر بھیجا کرتے تھے۔

۹۲

۱۲ر جنوری ۱۹۷۰ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
تحریک (دہلی) میرے نام آیا کرتا ہے۔ گوپال متل اس کے ایڈیٹر ہیں۔ کمیونسٹ اور کمیونزم کے دیرینہ مخالف۔ اُردو کے حق و حمایت میں جو بات صحیح سمجھتے ہیں اس کو ہمدردی سے اور برملا کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے بھی خیر طلب رہتے ہیں۔ تحریک کا حالیہ شمارہ بھیجتا ہوں۔ اس میں بمبئی کے اُردو کنونشن سے متعلق ایڈیٹر کا نوٹ اور ہندی کے ایک اسکالر کا مضمون ہے۔ دونوں کو ایک نظر ملاحظہ فرمالیجیے۔ چاہتا ہوں کہ ہماری زبان میں آپ اس پر اپنے انداز کے دو تین اداریے لکھ دیں جس سے مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔ اس سے اُردو سے الفت رکھنے والوں کو تقویت پہنچے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ رہبری ملے گی۔ اس موضوع پر آپ سے بہتر لکھنے والا دوسرا نہیں۔ ایسے مضمون کی بڑی ضرورت ہے اور ایسے ہی مضامین کی وقعت ہوگی۔ یوں بھی بمبئی کے اُردو کنونشن کا انجمن کو نوٹ لینا ضروری ہے۔
عجیب مصیبت ہے اردو اور اُردو سے متعلق ہر بات خواہ وہ علمی و تہذیبی

ہو یا جان و مال اور آبرو سے متعلق یتیم کا مال بن گئی ہے۔ ہر کس و ناکس جس طرح چاہتا ہے طبع آزمائی اور دست درازی کرتا رہتا ہے۔ اس وقت ملک کی ایک بڑی جماعت کو اس فکر میں مبتلا دیکھتا ہوں کہ کسی طرح مسلمان نامسلمان بنا دیے جائیں۔ ناگفتہ بہ کر دیے جائیں۔ جب سے کانگرس میں افتراق ہوا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تشدد اور نفرت کی مہم اور تیز ہو گئی ہے۔ اس وقت مسلمان ہی ایسا عنصر ہیں جن کے خلاف تمام سیاسی پارٹیاں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی مختلف اور متضاد کیوں نہ ہوں متحد ہو جائیں گی۔ مہا سبھا، جن سنگھ اور آر۔ ایس کا وجود اور اہمیت تمام تر اسی بنا پر ہے۔ بہر حال یہ ایک غیر متعلق بات تھی۔ دراصل آپ سے درخواست کرنا ہے کہ "تحریک" کے متذکرہ مضمون کو سامنے رکھ کر یا اس کے حوالے سے چند اداریے ہماری زبان میں لکھ دیجیے۔ ظاہر ہے آپ جو کچھ لکھیں گے وہ فرقہ وارانہ، سیاسی اور صحافتی بالکل نہیں بلکہ تاریخی، تہذیبی علمی اور واقعاتی ہوگا۔ آپ کے ان اداریوں کو اردو اخبارات بالضرور نقل کریں گے۔ صحیح صورتِ حال سامنے آئے گی اور سنجیدہ طریقِ کار کو لوگ اپنائیں گے۔ خدا کرے آپ اس کے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۹۳

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

۴ر فروری ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

اس سے پہلے ایک خط بھیج چکا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن سے معلوم ہوا تھا کہ آپ ماڈریشن کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے اور انھیں کے ساتھ واپس آئے۔ آنے پر وہ خط ملا ہوگا۔

ہماری زبان (یکم فروری کا) کل ملا۔ شمارہ و اعداد کے فن یا فنون کو آپ نے ادب کا درجہ دے دیا ہے۔ کتنا بلیغ یہ جملہ ہے۔ "جمہوریت اعداد و شمار کی بازی گری ہے[1]"۔ آپ کے اداریے پڑھتا ہوں تو آتش کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے ؎

آتش لکھی یہ تو نے غزل عاشقانہ کیا!

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جب تک مردم شماری ختم نہ ہو جائے۔ ہماری زبان کے ایک مستقل (inset) (اِن سٹ) میں زیرِ نظر اداریے کا آخری فقرہ درج ہوتا رہے جو شروع ہوتا ہے: "اگر اردو والے .... سے

---

[1] اداریہ "۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اردو"

اور ختم ہونا ہے اس پر .... وہ قلم ہوگا۔"[1]

یا اسی طرح یاد دہانی کا کوئی پیغام یا تاکید۔

آخر میں یہ نوٹ بھی ہو کہ اردو کو دوست رکھنے والے اخبار و رسائل سے درخواست ہے کہ وہ اس طرح کی یاد دہانی اپنے صفحات میں تا مردم شماری مسلسل شائع کرتے رہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] مکمل جملہ یہ ہے: "اگر اردو والے اپنی مادری زبان اُردو لکھوانے میں تساہل یا گریز سے کام لیں گے تو کم از کم اگلے دس سال تک ان کے قامت کی درازی انھیں اعداد و شمار سے ناپی جائے گی۔ مردم شماری کو اصطلاحاً سر شماری بھی کہا گیا ہے۔ یاد رہے جو سر شمار نہیں ہوگا وہ قلم ہوگا۔"

۹۴

۱۱ر فروری ۱۹۸۰ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل ہماری زبان کا پرچہ وصول ہوا۔ اداریہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ چاہتا تھا اور جس کی بشارت آپ پہلے دے چکے تھے۔ آپ کا ذہن عنوان[1] کی طرف کیسا منتقل ہوا اس کی داد نہیں دے سکتا۔ بے مثل ہے۔ بڑھاپے کی جہاں اور بہت سی بدتوفیقی ہے، ایک اس کا برخود غلط بھی ہونا ہے۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ عنوان مجھے کیوں نہ سوجھا! خیر یہ ایک جملہ بطور اعتراف تھا۔ کہنا یہ تھا کہ اس ذہانت اور خوش مزاقی سے جس کا اظہار عنوان کے انتخاب اور اس طرح کی دوسری باتوں سے ہوتا ہے۔ میں اس بات کا اندازہ کر لیتا ہوں کہ لکھنے والا کس مرتبہ اور معیار کا ہے۔ کبھی کبھی خیال آیا ہے کہ انجمن اور ہماری زبان کا جو چارج آپ کو ملا ہے اس میں اللہ کی کوئی بڑی مبارک مصلحت پوشیدہ ہے۔ کتنا ہی گنہگار رہا ہوں اللہ تعالیٰ

---

[1] اداریہ کا عنوان تھا "وہ دل اور دے ان کو ......" (۲۰ر فروری ۱۹۸۰ء)

کا مجھ پر جو فضل رہا ہے اس کے طفیل تھوڑے بہت یقین کے ساتھ خدا کے احسان کی دوسروں کو بشارت دے سکتا ہوں۔ اس لیے آپ کے لیے چاہتا ہوں کہ اس طرح کی "چتاونی" (معلوم نہیں کہ اس لفظ کا یہ محل ہے بھی یا نہیں) برابر شائع ہوتی رہے follow up کی بڑی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم نہیں کہاں کہاں سے کیسے کیسے راستے نکلتے ہیں۔ ہر چہار طرف جو ذلت اور ظلم پھیلا ہوا ہے اس کا نہ کسی کو غم ہے نہ شرم۔ بس ایک کارِ خیر رہ گیا ہے کہ اقلیت پر (جس کا عملاً اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے) عرصۂ حیات تنگ سے تنگ ہوتا رہے۔ اور کتنی بڑی حماقت یہ ہے کہ اقلیت کہہ دینے سے مسلمانوں پر ظلم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ آپ کے ادار یے اب لکھنؤ کے موقر ہفت روزہ عزائم میں بھی شائع ہونے لگے ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۹۵

۱۴ر فروری ۱۹۷۰ء

مسود صاحب محترم۔ آداب

ہماری زبان کا حالیہ پرچہ نظر سے گزرا۔ انگریزی کے بارے میں آپ نے جن خیالات کا ذکر کیا ہے اس سے اختلاف نہیں۔ لیکن آپ کے اس نظریے سے اتفاق کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ انگریزی کی جگہ مقامی یا ریاستیں زبانیں لے لیں گی۔ انگریزی کے بین ریاستی یا بین اقوامی زبان کی حیثیت کو مقامی زبانیں کیسے اختیار کر سکیں گی؟ انگریزی کی میں یہاں وکالت نہیں کر رہا ہوں بلکہ جو صورتِ حال ہے اس کا اظہار کرتا ہوں۔ انگریزی جاننے والوں کا بڑھتا شمار داعداد کے اعتبار سے کتنا ہی ناقابلِ اعتبار کیوں نہ ہو اس کی جامع حیثیات اس کی اتنی بڑی صفت ہے جو اس کی ہندوستان اور عالمگیر دونوں حیثیات کو تمام دوسری حیثیات پر بھاری کر دیتی ہے تعصب تنگ نظری اور خود غرضی سے قطع نظر تہذیب اور علوم ہر اعتبار سے

ے اداریہ "انگریزی اور ہم" (۱۵ر فروری ۱۹۷۰ء)

ہم کو حقیقت پسندی کے جبر کا ہمت اور خلوص سے مقابلہ کرنا چاہیے۔
اس پر کبھی پھر مفصل ہوگی۔

M.O.L.[1] کے ماڈریشن کے سلسلے میں جو بل گیا ہے اس کا کیا
حشر ہوا۔ اس سلسلے میں آپ کا دَین دار ہوں 'دَین دار' کے لفظ میں
احتیاط مدّنظر رہے۔ M.O.L. کے امتحانات تو ہو چکے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] عثمانیہ یونیورسٹی کا ایک اُردو کا امتحان جس کے پرچوں کے ماڈریشن کے لیے رشید صاحب اور میں مقرر ہوئے تھے۔

۹۶

جمعہ ۱۲ر مارچ ۷۰ء

ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی

سود صاحب مکرم۔ آداب

ہماری زبان ۷ر مارچ کا اداریہ" اردو! علاقائی یا دوسری سرکاری زبان" اس اعلیٰ پایے کا ہے جیسے آپ کے اداریے ہوا کرتے ہیں. تنقیح، توضیح، زبان اور زور ہر اعتبار سے اتنے مختصر مضمون میں آپ نے جیسے explosive (آتشگیر) مسئلہ پر جس سنجیدگی اور بالغ نظری سے اظہار خیال کیا ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا شمار ان چند (چند سے بھی کم) لوگوں میں کرتا ہوں جو ہندوستان میں ان دنوں اردو کے بہترین وکیل اور سفیر کہے جا سکتے ہیں.

چاہتا ہوں کہ آپ کے اداریے یا ان کا خلاصہ ہندوستان کی بیشتر قابلِ لحاظ زبانوں (بشمول انگریزی) کے کالموں میں جگہ پائے۔ یہ اداریے ان تحریروں اور تقریروں سے کہیں زیادہ مفید اور موثر ہیں جو عام طور پر اخبارات میں شائع اور پلیٹ فارم سے سنی جایا کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس تجویز پر بھی غور فرمایئے کہ آئندہ مردم شماری میں اردو کو مادری زبان لکھانے پر ہم کو اصرار کرنا چاہیے اور کسی طرح کے خوف

وخطر کا خیال نہ کرنا چاہیے۔ ان کو ہماری زبان میں متواتر یا تھوڑے تھوڑے وقفوں سے شائع کرتے رہنا چاہیے اور کسی اخبار کے کسی صفحے میں بطور inset اس کا اندراج ہو۔ عام نظروں کے سامنے یہ ہدایات مسلسل آتی رہیں گی تو اس کا خاطر خواہ اثر ہوگا۔ کیا تعجب اس کی تقلید دوسرے اردو اخبارات بھی کریں جو اردو کے مسئلے پر ہمارے ہم نوا ہوں inset کی عبارت وقتاً فوقتاً بدلتی رہے تو اور اچھا ہوگا inset پوسٹ کارڈ سائز کا ہو اور تحریر نسبتاً جلی اور پرکشش وغیرہ۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۹۰

جمرات ۲۶ مارچ ۱۹۷۰ء
ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
ہماری زبان کل ملا۔ اداریہ "زبان کا عروج وزوال" بہت اچھا ہے۔ ایسے اداریے ایک سے ایک اچھے آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ اس سے کتنوں کی ڈھارس بندھتی ہوگی اور میدان میں جمے رہنے کا حوصلہ پیدا ہوگا جیسا محسوس کرتا ہوں۔ یقین کر لیجیے کہ اچھے لوگ اسی طرح محسوس کرتے ہوں گے اس لیے کہ مجھ میں اس طرح کی مہارت تین چار پشتوں تک شریف اور ذی استعداد مسلمان نوجوانوں اور ادارہ کی اعلیٰ روایات میں بسر کرنے کے بعد پیدا ہوئی، اس لیے اس کے غلط ہونے کا امکان بہت کم ہے۔

لیڈری اور بلیڈری جیسے فقرے نہ لکھا کیجیے یہ آپس کی بے تکلف گفتگو میں، وہ بھی کبھی کبھی لطف دے جاتے ہیں۔ ایسی تحریروں میں بالخصوص جیسے کہ آپ کی ہوتی ہیں ان کا کوئی مقام نہیں۔ اس طرح کے فقرے مولانا ماجد صاحب کی اخباری تحریروں اور لب ولہجہ میں کھپ سکتے ہیں۔ زبان سے بے تکلفی برتنے یا اس کے آداب سے غافل ہو جانے میں یہ قباحت ہے کہ لکھنے کا معیار غیر شعوری طور پر گرنے لگتا ہے۔ دوسری طرف

محتاط رہنے اور ریاض کرنے سے اس کا معیار دیر میں اور دقت سے اونچا ہوتا ہے۔ کیا کیجیے اس دیس کی یہی ریت یا اس وادی کا یہی gradient ہے۔ بگاڑ یا سدھار کی طبعیات یا نفسیات یہی ہے۔ اس شمارے میں قیصر عثمانی کا مضمون اور اس کا رنگ و آہنگ کا معیار تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے بعض ذہنیتیں اسی اندازِ گفتگو کی مستحق ہوتی ہیں۔ کیا حرج ایوان ادب اور میدان مصاف ہی میں نہیں کبھی کبھی مخالفوں کا مقابلہ بازار میں بھی کر لیا جایا کرے۔

مسعود صاحب یہ سب تو ہو اور ہوتا ہی رہے گا۔ ایک درخواست ہے ایک نوجوان ہے نہایت ہی مفلوک الحال لیکن شائستہ، محنتی، دیانتدار تھوڑی بہت اردو پڑھا ہوا، نان شبینہ کا محتاج ہے، آپ کی انجمن میں اس کو چپراسی وغیرہ کی کوئی جگہ مل جائے گی؟ ایسا ہو جاتا تو کتنا خوش اور شکر گزار ہوتا اتنا وہ نہیں جتنا میں!

پلاؤ اور لیموؤں کا بہت بہت شکریہ!

مخلص

رشید احمد صدیقی

۹۸

جمعہ، ۱۵ اپریل ۷۰ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب تسلیم

ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں جو اداریہ ''اپنے عمل کا حساب'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ پچھلے ۲۰۔۲۲ سال میں اُردو دوستوں کی رفتار و روش کا بڑا حقیقت پسندانہ جائزہ ہے۔ ذاکر صاحب سے متعلق مایوسی و ملامت کی ایک زیریں لیکن واضح لہر بھی ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرحوم نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور خود اپنی حیثیت سے جو کسی دوسری حیثیت سے کمتر نہ تھی اُردو وفد کی جو قیادت کی تھی وہ موقع و محل کے اعتبار سے مناسب اور ضروری تھی۔ دوسری طرف انھوں نے گورنر، نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے اُردو کے لیے جو کچھ نہیں کیا وہ بھی مصلحت اور منصب دونوں اعتبار سے درست تھا۔ آئینی گورنر، نائب صدر اور صدر وہی کر سکتا ہے، کرے گا اور کرنا چاہیے جس کا متعلقہ کابینہ اس کا مشورہ دے۔ ایسے مسئلے میں جیسا کہ اُردو کا تھا وہ اپنی ذاتی، انفرادی یا کسی اور حیثیت کو کام میں نہیں لا سکتے تھے، کوئی ایسا اقدام بہت بڑے اور خطرناک حد تک سیاسی crisis کا موجب ہوتا اور صورت حال بد سے بدتر ہو جاتی۔ میرا خیال تو یہاں تک ہے کہ ایسا کرنے سے ملک کے

سنجیدہ اور صلح پسند عناصر کا تقویت پہنچنے کے بجائے اشرار کو قتل و غارت گری کا بہانہ مل جاتا۔ اس طرح اُردو کو نفع سے کہیں زیادہ نقصان پہنچ جاتا۔ اردو سے زیادہ مسلمانوں کے ناموس جان اور مال کو۔ جیسا کہ آزادی کے ملنے کے بعد سے اب تک دیکھنے میں آرہا ہے۔ کچھ تعجب نہیں اُردو کو اس وقت جو تائید غیر مسلموں سے مل رہی ہے وہ معدوم نہیں تو متزلزل ہو جاتی۔ جمہوری طرزِ حکومت میں اقلیت کے حق میں یہ بڑا المناک حادثہ ہوتا۔

مسلمانوں کی غلط اندیشی، غلط روی یا سہل انگاری کے بارے میں آپ نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بظاہر بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم آپ اس صورتِ حال کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ جہاں تک اُردو کی حمایت یا اُردو سے نامنصفی پر احتجاج کا تعلق ہے مسلمانوں کی پوزیشن یا strategy جارحانہ نہیں مدافعانہ ہے (منافقانہ یا نامنافقانہ بھی) مخالف قوتیں اقتدار، طاقت، تعداد اور تاریخ غرض وہ تمام حربے جو ہماری زبان، مذہب، تہذیب اور معاشرت کو مسخ یا معدوم کر دینے کے لیے بر سرِ کار لائے جا سکتے ہیں۔ بڑی دھاندلی، بے باکی اور سفاکی سے کام میں لائے جا رہے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد سے مسلمان کبھی اُردو کے اپنے ادارے (تعلیم گاہیں) قائم کرنے کے لیے بھاگے پھرے ہیں اور کبھی ہندی کی طرف دوڑے ہیں کہ کہیں ان کے بچے ہندی سے ناآشنا رہ کر ہندی کی دنیا میں پیچھے رہ کر پامال نہ ہو جائیں۔ ہندی سیکھنے کی طرف سے کچھ مطمئن ہوتے ہیں تو معاً اُردو کا خیال آتا ہے اور بے اختیار دوڑے ہوئے واپس آتے ہیں کہ اس سنگلاخ زمین کو کہاں تک کار آمد بنا سکیں۔ آپ

سعیٔ صفا و مروہ کی روایت سے واقف ہوں گے کہ جو ارکانِ حج کا بڑا اہم رکن ہے۔ یعنی کس طرح حضرت اسماعیلؑ کی ولادت پر ان کی ماں حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں بے اختیار بھاگتی ہوئی دور تک چلی جاتیں۔ معاً حضرت اسماعیلؑ کی تنہائی، تشنگی اور تحفظ کا خیال آتا تو بے قرار و بے اختیار ان کی خبر گیری کے لیے واپس آتیں۔ اُردو کے تحفظ کی تنظیم اور ہندی کی بالادستی کی تنظیم جن فرقوں کے ہاتھ میں ہے ان سے آپ واقف ہیں۔ مسلمان انہی دونوں صفا و مروہ کے درمیان بھاگتے نہ پھریں تو کیا کریں۔ حضرت اسماعیلؑ کے ایڑی رگڑنے سے آبِ صافی کا چشمہ ابل پڑا تھا دیکھیے اُردو کے پاؤں یا ناک رگڑنے سے کیا برآمد ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد سے اُردو والوں پر جو مصیبت اور ذمہ داری آئی ہے اس کا ہم سب کو احساس ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کے جس رویہ کی آپ نے شکایت کی ہے وہ قابلِ معافی ہو یا نہیں سمجھ میں آتی ہے۔ اُردو کے چھوٹے بڑے ادارے قائم کرنے کے لیے جس طرح ہم کوشش کر رہے ہیں وہ کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہو۔ بدلے ہوئے حالات اور "بانگ جیلا" مشتعل ہو جانے والی فضا کو دیکھتے ہوئے قابلِ لحاظ بھی نہیں ہے۔ جیسی مجبوریوں اور محرومیوں کا سامنا ہے وہ معمولی نہیں ہے۔ ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا کہ جب تک اُردو میڈیم کی چھوٹی بڑی تعلیم گاہیں قائم نہ ہو جائیں مسلمان بچے بچیاں جہاں کی تہاں رہنے دی جائیں۔ اُردو کے لیے ساری سہولتیں فراہم کر دی جائیں جب بھی مسلمان لڑکوں لڑکیوں کو ہندی نہیں علاقائی زبان میں بھی مہارت

مہارت پیدا کرنی پڑے گی۔ یہ کسالتی فارمولے میں اگر اردو کی تعلیم کی گنجائش نہیں نکلتی یا گنجائش نکلنے نہیں دی جاتی تو جن کی مادری زبان اردو ہے ان کو اپنے بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کا بندوبست اپنے طور پر کرنا پڑے گا۔ یہ پوزیشن کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو لازم مفر نہیں قیمت چاہے جتنی دینی پڑے!

(بقول غالب .... یہ عریضہ چھاپنے کے لیے نہیں چھپانے کے لیے ہے)

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۹۹

۱۵ اپریل ۸۰ء

مسعود صاحب محترم۔ آداب

یہ خط اور پھول صبح سے رکھے ہوئے تھے کوئی لے جانے والا نہ ملا۔ آج کل ہمارے یہاں خانساماں اور مالی دونوں من مانی چھٹی پر ہیں۔ ہماری زبان کا اسپیشل نمبر[1] تھوڑی دیر ہوئی ملا۔ واقعی ایسا ہی ہے بلکہ اس سے بڑھا ہوا جتنا آپ نے بتایا تھا۔ آزادی کے بعد کی اردو کا یہ کاغذی پیرہن یادگار رہے گا۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا۔ خدا آپ کو اجرِ نیک اور ہم سب کو آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی عقل اور ہمت دے۔ بقیہ پھر کبھی عرض کروں گا۔ انشاءاللہ۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] ۱۵ اپریل ۸۰ء جس میں اداریہ "اردو کا محضر نامہ" شائع ہوا تھا۔

۱۰۰

۲۴؍اپریل ۶۰ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

کل شام خط ملا۔ پڑھ کر نادم بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ سمجھا تھا کہ بفحوائے "عطائے تو بہ لقائے تو" پر عمل کر رہا ہوں، لیکن ہوا یہ کہ کس کس کا لباس آپ کی قامت پر چست یا تنگ ہو گیا۔ ایسے میں غالب "نامہ بر ہے کیا کہیے" کہہ کر چپ ہو گئے تھے۔ آپ بھی جامعہ کے پوربی پٹھان[1] یا پوربیے پٹھان کو معاف کر دیجیے میں اس سے بازپرس کروں گا۔ اپنی یا نامہ بر کی فروگذاشت کی تلافی بہتر شکل میں انشاء اللہ چند دنوں میں کر سکوں گا۔ آج شعبے میں آپ کس وقت ۱۵ - ۲۰ منٹ کے لیے کم مصروف ہوں گے تاکہ اسی وقت مل سکوں۔ ممکن ہے موسم کی آڑ پکڑ کے نہ بھی آؤں۔ لیکن شاید ایسا نہ ہو۔ اس لیے کہ موسم کی آڑ یا پناہ پکڑنا ان دنوں سب سے خطرناک ہے۔

آپ کا ۔

رشید احمد صدیقی

---

[1] جامعہ اردو کے ایک پوربی پٹھان چپراسی جو پہلوان کے نام سے معروف تھے۔

۱۰۱

۱۰ اپریل ۱۹۷۰ء

مسعود صاحب محترم۔ آداب

ہماری زبان میں "ایک ادارہ ایک زبان"[۱] کے عنوان سے ایک اداریہ پیش نظر ہے۔ علی گڑھ کا جو مسلک سرسیدؒ سے لے کر رہا ہے اس کے بارے میں آپ نے جس فاضلانہ اور فن کارانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اس کی داد غالبؔ کی زبان میں اس شعر سے دی جا سکتی ہے جس سے انھوں نے اپنے کلام کی داد دی ہے ؎

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدیق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل!

علی گڑھ میں اُردو کے ساتھ جو سلوک اب تک وقتاً فوقتاً ہوتا رہا وہ مختلف محرکات و مقتضیات کی بنا پر ہوا۔ سرسیدؒ نے اردو کی حمایت انہی محرکات کی بنا پر ابتدائے کار سے ورنیکولر یونیورسٹی کے منصوبے سے دست بردار ہونے تک کی۔ غدر کے بعد جو شکست و ریخت اور درو بست ہوئی اس میں مسلمان گھاٹے میں رہے۔ معیشت، تجارت، سیاست

---

[۱] ۱۲ اپریل ۱۹۷۰ء

تعلیم، تنظیم ہر اعتبار سے ابنائے وطن کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ در ماندہ وپسماندہ اور ان سب پر مستزاد انگریز اور انگریزی حکومت کی نظر میں مقہور ومغضوب تھے۔ مسلمانوں کی آبادکاری کے لیے سرسید ہر سطح پر ہر جہت میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ جیسی تشویشناک ایمرجنسی میں انھوں نے مسلمانوں کو پایا تھا اس میں کسی اسکیم یا پروگرام کے ترک وقبول کا مسئلہ طویل میعادی نہیں ہوتا بلکہ بدلتے ہوئے حالات وحوادث کے پیش نظر جلد جلد بدلتا رہتا ہے۔ سرسید نے ورناکیولر یونیورسٹی کا مسئلہ تقاضائے وقت سے ترک کر دیا تھا اس لیے کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی طرز فکر کو جلد سے جلد مسلمانوں میں مقبول بنانا چاہتے تھے۔ اردو یونیورسٹی ان مصالح اور مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی تھی جن کا پورا کیا جانا لازم آتا تھا۔ تقدیر کے جن کن میکلوں کے دوراہے پر سرسید کھڑے تھے اس میں انگریزی کو اردو پر ترجیح دینے میں وہ یقیناً حق بجانب تھے۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ وہ صورت حال آج تک قائم ہے۔ سوا اس کے کہ سرسید کے بعد بھی علی گڑھ میں اُردو یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی یا اردو کو وسیلہ تعلیم نہیں بنایا گیا۔ اُردو کی ترقی میں علی گڑھ نے قابل فخر نہیں تو قابل اطمینان حد تک ضرور کوشش کی ہے۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ علی گڑھ نے اُردو کے لیے جو کچھ کیا اس کو بہت آسانی کے ساتھ ان خدمات کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں جو حیدرآباد نے انجام دیں —— اور حیدرآباد حکومت ہند کے بعد ہندوستان کی سب سے بڑی حکومت تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کو اُردو یونیورسٹی بنانے میں جو موانع یا نقصانات

تقسیم ملک سے پہلے تھے اس سے بدرجہا زیادہ اب ہیں اور آپ اندازہ کر سکتے ہوں گے۔ آزادی کے بعد اردو کے ساتھ جو سلوک ہر سطح پر جس بے باکی اور بے رحمی سے مسلسل کیا گیا اور اب تک کیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر آج موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کیا حشر ہوتا اور کیسی تباہی آئی ہوئی ہوتی۔ اگر جامعہ عثمانیہ کی طرح اردو یونیورسٹی ہوتی۔ آپ تو واقف ہیں ابنائے وطن مسلم یونیورسٹی کے مکمل اور معیاری یونیورسٹی ہونے کے باوجود یہی پروپگنڈا کرتے رہے کہ اس کا اسٹینڈرڈ گرا ہوا ہے!! جیسے فرسٹ کلاس انگریزی یونیورسٹی ہوتے ہوئے بھی مسلم یونیورسٹی "ورناکیولر" تھی۔ ہم میں سے کس کو خیال تھا کہ ملک تقسیم ہوگا اور نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ مسلمان اور ان کے ادارے کس میرس اور کس مخرہو جائیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم جو ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام دھرتے اور پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ آزادی یوں ملے گی، ملک اس طرح تقسیم ہوگا۔ مسلمانوں کے ادارے، ان کی زبان، ان کے مذہبی و معاشرتی مسائل، ان کی جان، مال، آبرو کا وہ حال ہوگا جو دیکھنے میں آرہا ہے۔ کس کو معلوم تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان اور جن چیزوں کو وہ عزیز رکھتے ہیں اس حالت کو پہنچ جائیں گے یا پہنچا دیے جائیں گے جن میں وہ مبتلا ہیں۔ مسلم یونیورسٹی اس وقت قائم ہی اس بنا پر ہے کہ وہ ورناکیولر یونیورسٹی نہیں تھی اگر ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا تو صورت حال بالکل جداگانہ ہوتی ——— یہاں تک کہ جو چیزیں آج خطرے میں نظر آتی ہیں وہ اس وقت سب سے

زیادہ محفوظ، معتبر اور دانش مندانہ سمجھی جاتی ہیں۔ رہا یہ کہ ہم سب وہ باتیں اب کیوں نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ اسی طرح جس طرح حضرت ہاجرہ کرتی تھیں۔ جب وادیِ غیر ذی ذرع میں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی تھی ______ آپ نے کالج کے ترانے کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں ملامت اور استہزار کی جھلک آگئی ہے ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ ترانہ طلبار کا جوش دروں ہے اور نیک علامت ہے۔ معلم کو اپنے شاگردوں کے اس طرح کے خیالات سے بدگمان یا بدحظ نہ ہونا چاہیے۔

میری باتوں سے آزردہ نہ ہوجیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ موقع آئے گا تو آپ جاوید سے اسی طرح کی باتیں کریں گے۔ اخبار تو کوئی لے گیا۔ مضمون کا صرف مبہم سا خیال رہ گیا ہے۔ ممکن ہے آپ نے کچھ کہا ہو میں نادانستگی میں کچھ کہہ گیا ہوں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۰۲

۱۰ ارمئی ۷۸ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

اڑتی سی ایک خبر ہے زبانی پٹھانؒ[1] کے ۔ کہ آپ واپس تشریف لائے ۔ سیمینار کی مختصر روئداد جو بمنزلہ خبر کے تھی اخبارات میں دیکھی ۔ آپ سے انشاء اللہ اور کسی وقت تفصیل معلوم ہو گی ۔ امید ہے کہ وقت اچھا گزرا ہو گا ۔

آپ کے دو اداریوں پر میں نے بطور حاشیہ کچھ لکھ بھیجا تھا ۔ اگر ان کو آپ نے تلف کر دیا ہو تو فبہا ۔ لیکن اگر رکھ لیا ہو یا اس کی ایک بات ذہن میں محفوظ رہ گئی ہو تو اس کی تصحیح کر لیجیے گا ۔ میں نے لکھا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ بی بی سارہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے حالاں کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ بی بی ہاجرہؓ تھیں ۔

مقابلے کا کیا رہا ۔ دوسری طرف سے گفتگو تو ہے لیکن پائے سخن یا جائے سخن درمیان نہیں کا انداز ہے پس چہ باید کرد ۔

کشمیر کے موسم کا درد تہہ جام تو آپ لائے ، ہے غضب " ہائے ہائے " اور صرفِ نظر کا بھی سامان رہا ؟

مخلص

رشید احمد صدیقی

سارہ اور ہاجرہ کی تصدیق آپ خود بھی کر لیجیے گا ۔ شکریہ

---

[1] جامعۂ اردو کے چپراسی ایک پوربی پٹھان جو پہلوان کے نام سے معروف تھے ۔

۱۰۳

۴ر جون ۶۷ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

تکلیف فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ اسے ایک نظر دیکھ جاتا تو ٹائپ کرادوں۔ کیا معلوم تھا کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی لیکن اس کی خوشی ہے کہ میرے دعا مانگنے سے پہلے آپ صحتیاب ہوگئے جیسے خدا نے میری دعا کو anticipate کر کے آپ کو اچھا کر دیا ہو! کیا ایسے بزرگ بھی ہو یار خود غلط بند ایسے نہ ہوتے ہوں گے؟!

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۰۴

۱۸ جون ۷۶ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

گئودان اور اس کے ترجمے سے متعلق ہماری زبان کے پچھلے شمارہ میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اور حالیہ اشاعت میں اس کی مزید توضیح کی ہے وہ میں نے بہت شوق سے پڑھا اور اتنا ہی خوش ہوا۔ گئودان کے اُردو اور ہندی ٹیکسٹ میں diction کا جو فرق ہے اور ایک موقع پر کافِ بیانیہ کی جس بلاغت کی آپ نے نشان دہی کی ہے وہ لاجواب ہے۔ اُردو کے لسانی ہی نہیں ادبی و علمی مسائل کی بحث کے اونچے معیار کا التزام رکھتے ہوئے آپ گفتگو کو جس حسنِ ادا سے ختم کرتے ہیں وہ بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔ آج کے مضمون کا ایسا ہی ہوا ہے۔ کوئی بھی جو اس سے پچاس فی صدی درجے کا اختتامیہ لکھتا تو مبارکباد کا مستحق ہوتا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

جنرل ایجوکیشن کے مبین صاحب[1] ملنے آئے تھے انھوں نے آپ کے یہاں کسی اسامی کے لیے درخواست دی ہے اور مجھے بطور ریفری لکھا دیا ہے۔ میں ان کو بہت دنوں سے اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بڑے محنتی، بردبار، ذہین اور وفا شعار ہیں۔ آپ ان سے اور ان کے کام سے بہت خوش ہوں گے۔ ساتھ یا ماتحتی میں کام کرنے والوں کو جن صفات کا حامل ہونا چاہیئے وہ ان میں کافی ملتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی

---

[1] مبین احمد خاں، موجودہ لکچرر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۰۵

۱۲ر اکتوبر ۷۰ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

احسان آپ کے یہاں سے دعوت سے واپس آئے تو آج کل کا جون کا شمارہ اور ہماری زبان کے وہ مضامین بھی لائے جو آپ نے اردو کے مسئلہ پر اپنے عہد ادارت میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ اول الذکر کا مجھے علم نہ تھا اس لیے کہ آج کل میرے پاس نہیں آتا۔ آپ نے خوب کیا کہ اپنی ادارتی تحریروں کی فائیل احسان کو پڑھنے کے لیے دیدی۔ یہ مضامین ان کو ہمیشہ inspiration دیں گے اور وہ اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے۔

"غبارِ کارواں"[1] کے تحت آپ کا مضمون بہت پسند آیا۔ آپ بیتی یا اپنا اعمال نامہ لکھنے کا یہ بڑا اچھا تقریباً بے مثل نمونہ ہے۔ کیسے کیسے اخلاقی واکتسابی صفات اور ہنر اس طرح کے مضامین لکھنے میں درکار ہوتے ہیں اس کا اندازہ مضمون پڑھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے تعجب تھا کہ آپ کی تحریر میں فلسفیانہ گہرائی اور حالات وحوادث سے اس کی

---

[1] یہ خود نوشت سوانحی خاکوں کا سلسلہ تھا جس کے تحت مدیر آج کل نے مختلف حضرات سے مضامین لکھوائے تھے۔

تطبیق کہاں سے آئی۔ پھر یہ کہ اس میں فلسفہ کی خشکی کا نام نہیں۔
تو احسان نے بتایا اور مجھے یاد آگیا کہ آپ نے اُردو Ph.D کرنے
کے بعد شریف صاحب[1] مرحوم کے ساتھ فلسفہ کا مطالعہ شروع کر دیا تھا
اس کے بعد پروگرام بدل گیا اور آپ ہندوستان سے باہر چلے گئے۔
دوسرے یہ کہ آپ کی اور عابد صاحب[2] کی تحریروں میں حشو وزوائد کا
نام نہیں ہوتا۔ عابد صاحب کے مضمون بالعموم علمی ہوتے ہیں اس
میں حشو وزوائد سے بچنا آسان ہے لیکن ایسے مضامین جیسے کہ آپ
کے ہوتے ہیں ان میں قلم کی رعنائیوں کو قائم رکھتے ہوئے زوائد سے
بچنا آسان نہیں ہے musings and jottings میں fade out کے مراحل
قدم قدم پر پیش آتے ہیں اس لیے مصنف vague, hazy and
indifferent ہوجاتا ہے۔ آپ کے ہاں یہ بالکل نہیں ہے اور یہ آپ
کا کارنامہ ہے۔ آپ نے اپنے کو پیش کرنے میں عہدِ طفولیت کے
جو محرکات و موثرات لکھے ہیں وہ بے مثل ہیں۔ آج سے پچاس
سال پہلے کے متوسط مسلمان شریف گھرانوں کا یہی نقشہ تھا۔ آپ کی
تحریر سے وہ زمانہ وہ لوگ یاد آگئے اور دیر تک یاد آتے رہے۔
ذاکر صاحب پر آپ نے چند سطروں میں جو کچھ اور جس طرح لکھ دیا
ہے وہ اوروں کے طویل مضامین پر بھاری ہے۔ کیسی اور کتنی عجیب
بات ہے کہ آپ کے مضمون کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے آپ کو اور آپ کی تحریر

---

[1] پروفیسر محمد شریف صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

[2] ڈاکٹر سید عابد حسین

کو بھول گیا۔ صرف مرحوم یاد آتے رہے۔

اس کا بھی تعجب ہے کہ آپ کے مضمون کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے آپ کو اور آپ کی زبان سے جو کچھ سنتا رہا ہوں اس سے مختلف اس مضمون میں پایا۔ یہ فن کار کی شرافت اور عظمت کی نشانی ہے۔ مبارک ہو۔

دیر تک لکھتے رہنے سے تھک جاتا ہوں۔ بڑھاپے میں جب قویٰ جواب دینے لگے ہوں، لیکن خیال اور فکر کی طغیانی بڑھنے لگی ہو یہ صورتِ حال بڑی المناک ہوتی ہے۔ دست و پایم بشکستند و کمانم دادند! رہے نام اللہ کا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۱۰۶

۲۷ جنوری ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم۔ آداب

معلوم نہیں آپ کا مزاج اب کیسا ہے۔ موسم اعتدال پر نہیں ہے۔ اس لیے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اب بھی تکلیف باقی نہ ہو۔ ۱۰ روز سے میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس لیے دہلی کا جانا ملتوی کرنا پڑا۔

خواجہ صاحب کو دلی تار دیدیا ہے کہ جمعہ کے دن مذاکرے میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ ایسا ہی اگر معذور نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔

میں نے جو مضمون بھیجا ہے اس کی ایسی جلدی نہیں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی نظر سے گزر جائے پھر مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ اس لیے کہ بہت سی ایسی باتیں محض بحث آگئی ہیں جو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں بالخصوص دکھنی زبان۔ دکن کی تاریخ اور دربار دکن کے احوال۔

میری دشواری یہ تھی کہ کلام میں[1] مطلقاً جان نہیں ہے۔ کس بات کو

---

[1] کلیات اردو حضور نظام میر عثمان علی خاں جو رشید صاحب کے پاس حیدر آباد سے پیش لفظ کے لیے بھیجی گئی تھی۔

سراہا جائے اور سراہا بھی جائے تو کب تک۔ ہر طرف کی مثالیں کثرت سے
دینی پڑیں تاکہ کچھ تو ستائش کا پہلو کہیں سے نمایاں ہو جائے۔ کچھ
ایسی باتیں لکھنی پڑیں جو کلام سے نہیں صاحب کلام سے متعلق ہیں
تاکہ موصوف ہی کا نام اونچا ہو جائے۔ کہیں کہیں فن پر کچھ باتیں آگئی
ہیں۔ بہرحال جو کچھ سمجھ سکا کر دیا۔ بے ضرورت اجزار کو حذف کر دیجیے
گا۔ کہیں آپ کو ستائش کا پہلو مل جائے تو اضافہ فرما دیجیے گا
مگر سب سے مقدم یہ ہے کہ آپ اچھے ہو گئے ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۰۷

۱۸ر فروری ۷۱ء

مسعود صاحب

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ مرسلہ اوراق ملے۔ ان ریشم کے ٹکڑوں پر ٹاٹ کے پیوند کیسے لگاؤں اور کہاں کہاں لگاؤں متن اور حواشی میں جا بجا تضاد ملتا ہے اس کا ہموار کرنا آسان نہیں ہے۔

ایک مدت سے کراچی اور ڈھاکہ سے بچوں کی خیر و عافیت کا کوئی خط نہیں آیا اس سے بڑے تردد میں رہنے لگا ہوں کام کرنے میں جی نہیں لگتا، کچھ کرنے لگتا ہوں تو جلد تھک جاتا ہوں۔

آپ فاروقی صاحب کو کہہ دیں کہ وہ اپنا مضمون (رسم خط پر) بھیج دیں، میرا حاضر ہے جب چاہیئے گا منگا لیجیے گا۔

میرا وہ خط تو ملا ہو گا جو پرو وائس چانسلر[1] کے خط کی پشت پر

---

[1] جناب فضل الرحمٰن صاحب

میں نے لکھ دیا تھا۔ بلگرامی صاحب[1] آپ کے ساتھ کام کریں گے یا ان کا دفتر پرو وائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں حسبِ دستور رہے گا۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی ادارت میں پہلا شمارہ[2] نکلے تو اس میں رسمِ خط کے مسئلے پر آپ کا ایک مضمون ضرور ہو۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] شریف الحسن بلگرامی صاحب جو اس وقت فکر و نظر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔

[2] اشارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی تحقیقی مجلہ فکر و نظر کی جانب ہے جس کا مدیر اسال ایڈیٹر مقرر ہوا تھا۔

۱۰۸

جمعہ ۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسود صاحب مکرم۔ آداب
یکم اپریل کے ہماری زبان میں آپ کا مضمون پروفیسر سروری مرحوم پر نظر سے گذرا۔ بہت پسند آیا اور متاثر ہوا۔ اتنے سے مختصر مضمون میں آپ نے وہ تمام حقوق ادا کر دیے جو مرحوم کی طرف سے آپ پر اور خود آپ کی طرف سے آپ پر عائد ہوتے تھے! یہ ایک غیر معمولی بات ہے جو کہیں کم دیکھنے میں آتی ہے۔
اللہ تعالیٰ آپ میں اس طرح کی صلاحیت اور قدرت ہمیشہ بیدار اور بالیدہ رکھے۔ آمین۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۰۹

۱۵ اپریل ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

تقریباً دو ہفتے ہوئے ایک خط لکھا تھا جس کا جواب نہ آیا۔ گو اس میں ایسی ضروری باتیں بھی نہ تھیں جس کا جواب مطلوب تھا۔ دریافت یہ کیا تھا کہ رسم خط والے مضمون کے کچھ reprints مل سکیں گے یا نہیں؟ انہی شرائط پر جن پر ذاکر صاحب والے مضمون کے ملے تھے۔ دوسرے یہ کہ فکر و نظر کے دوسرے شمارے میں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم والے مضمون کے لیے کم و بیش ۳۰ صفحات کی گنجائش نکل سکے گی یا نہیں؟ چاہتا ہوں کہ ایک ہی شمارے میں نکل جائے۔ بالاقساط شائع کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔

انجمن ترقی اردو کے کن چار ناموں کو ووٹ دیے جائیں۔ یوسف صاحب، نظامی صاحب، محمود الٰہی صاحب اور حبیب الرحمٰن صاحب کے ذو امیدواروں میں سے کسی ایک کو دینا چاہتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آج شام چھ بجے علیم صاحب سے جامعہ اردو سے متعلق کچھ باتوں پر گفتگو کرنی ہے۔ امید ہے آپ سب مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۱۰

۲۸ رمئی ۷۱ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

آج انجمن ترقی اُردو کی ادبی اور عاملہ کی میٹنگ ۱/۲ ۸ بجے سے غالباً ساڑھے بارہ ایک بجے تک ہو۔ میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ اب اس طرح کے اجتماع سے تھک اور اکتا چکا ہوں۔ کل شام مالک رام صاحب سے ملاقات ہوئی ان کی رائے ہے اور مجھے بھی اتفاق ہے کہ اس سال جامعہ کے کنوکیشن کو ڈاکٹر سید عابد حسین (جامعہ ملیہ دہلی) خطاب فرمائیں۔ مالک رام صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ عابد صاحب سے عرض کردیں گے کہ ارباب جامعہ کی یہ درخواست ہے۔ امید ہے آپ کو بھی اتفاق ہوگا۔ مالک رام صاحب کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ انجمن ترقی اردو کی خدمات کو قابلِ اطمینان نہیں سمجھتے اس کا اظہار وہ آج کسی میٹنگ میں کریں گے۔

ڈاکٹر یوسف صاحب انجمن ترقی اُردو کے ممبر منتخب ہو گئے اس کی بڑی خوشی ہے۔ ان کے ہونے سے انجمن کی ساکھ بڑھے گی۔ امید ہے آپ مسرور مع الخیر ہوں گے

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۱۱

۳؍جون ۷۱ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

مسودہ ارسالِ خدمت ہے۔ آپ نے جہاں جہاں نشان دہی کی تھی اسے درست کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر مقامات پر پورے پورے پیراگراف حذف کر دیے ہیں۔ جہاں تہاں کچھ اضافے بھی ملیں گے لیکن نہ ایسے کہ مخلِ نظر ہوں۔

البتہ ص ۳۹ کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ factual نہیں تو مجازیہ ہے ایک آدھ جگہ اس کی بھی گنجائش رکھی جائے تو ایسا کوئی حرج نہیں۔ اگر بہت زیادہ زحمت نہ ہو تو ایک نظر پھر دیکھ جائیے گا۔ اب بحیثیت مجموعی یہ تحریر ہموار ہو گئی ہے یا نہیں۔ شکریہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۱۲

۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم
ڈاکٹر فریدی صاحب کے مسودہ پر آپ کے notes کا شکر گزار ہوں جن کو میں نے بجنسہٖ موصوف کے پاس بھیجدیا۔ فریدی صاحب کو ایسے مخلص اور مبصر کہاں ملتے ہیں جیسے کہ آپ ہیں۔ ان کے notes میں رفعت آگئی۔

رسم خط کے ۲۵ reprints مجھے مل گئے تھے بگرامی صاحب نے بتایا تھا کہ دس روپے کا بل بھیجدوں گا۔ لیکن اب تک بھیجا نہیں۔ ایسا کیوں نہ کیجیے کہ جب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد والے مضمون کا معاوضہ دیں تو اس کے ۵۰ reprints اور رسم خط کے اس غالہ کی رقم کے bills اس میں وضع فرمالیں۔ میرے لیے یہ سہولت ہوگی۔ خدا کے فضل سے اچھا ہونے لگا ہوں لیکن نہ ایسا کہ کچھ پڑھ لکھ سکوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۱۳

۲۳ راگست ۷۱ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
آج کل یوپی اسمبلی میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کا تقاضا پیش ہے۔ اُردو کے بہی خواہ اپنے طور پر جو کر پاتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی غیر موثر اور صدا بصحرا کیوں نہ ہو۔

اک نالہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

یونیورسٹی اسٹاف کلب سے اس کی تائید میں ایک رسمی رزولیشن بھجوا دیجیے۔ اُردو کے ایک ممتاز خدمت گزار ہونے کے سبب سے یوں بھی لوگ متوقع ہوں گے کہ آپ اس طرف توجہ فرمائیں۔ اس رزولیشن کے لیے دھوم دھام کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ نہایت خاموشی سے بالکل رسمی طور پر رزولیشن بھیجدیجیے اس کو بعد میں ratify کرا لیجیے گا[۱]

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[۱] میں اس وقت یونیورسٹی ٹیچنگ اسٹاف کلب کا صدر تھا۔

۱۱۴

دوشنبہ ۲۰ ستمبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب

پرسوں شام مبین آئے تھے۔ ان کے بارے میں کچھ عرصہ ہوا آپ سے عرض معروض کر چکا ہوں۔ وفادار، محنتی اور ذہین نوجوان ہیں۔ ممکن ہے کچھ موانع ہوں جن سے وہ واقف نہیں۔ یوں مستحق معلوم ہوتے ہیں۔

ہماری زبان کے پچھلے شمارہ[۱] میں یا اس سے پہلے آپ کا مضمون دیکھا تھا، بات صحیح تھی اور آپ ہمیشہ صحیح ہی بات پر زور دیتے ہیں۔ لیکن جن سیاق و سباق میں (اور خلاف معمول تلخ لہجہ میں) آپ نے گفتگو کی تھی اس سے تکلیف ہوئی۔ ہر چہار طرف سے یوں ہی کیا کم لعنت کی بارش ہو رہی ہے کہ اس میں ہم آپ بھی اضافہ کرنے لگیں امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

۱ میرا مضمون: کفارہ۔ یکم ستمبر ۱۹۷۱ء

۱۱۵

بدھ ۲۲ر ستمبر ۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

عنایت نامہ موصول ہوا۔ آپ کی اصابت رائے کا قائل ہوں۔ آج سے نہیں بہت سے دنوں سے۔ حال ہی میں آپ نے اُردو پروفیسر کے تقرر سے متعلق ایک نہایت ہی سچی اور اونچی بات کہی تھی۔ یعنی کسی مسلم ادارے میں اُردو میں پروفیسر ہونے کے لیے پیشہ ورانہ استعداد اور زبان وادب سے متعلق اس کے اسناد اتنے ضروری نہیں ہیں جتنی اُردو سے اس کی جذباتی وابستگی۔ اپنے مضمون کی تائید میں جن صاحب کا قول نقل کیا ہے ان کو روایتی طور پر ان اقدار سے بَیر رہا ہے جن کو ہم نے آپ نے اپنا رکھا ہے اور باتوں کے قطع نظر ان کو اُردو سے جذباتی ہم آہنگی نہیں ہے۔ وہ اس قیامت صغریٰ سے اس لیے متاثر نہیں کہ ہم آپ متاثر ہیں بلکہ زیادہ تر اس لیے اس سے حکومت کو اختلاف

له یہ خط اور خط نمبر ۱۱۰ ایک ہی ہیں صرف چند سطروں کا فرق ہے۔

ہی نہیں عناد ہے۔ ممدوح نے اُردو کی شکایت میں دشمن کا ہم زبان ہی نہیں ہم طرح بننا قبول کر لیا ہے۔ حکومت کی تائید اور ہماری دل آزاری میں وہ تمام اخلاق واقدار کے محافظ اور مبلغ بن جائیں گے۔ اس قبیلہ نے مسلمانوں کو جیسے جیسے نقصان پہنچائے ہیں تاریخ ان کی گواہ ہے ہم آپ بھی ہر روز یہی دیکھتے آئے ہیں۔ میرے نزدیک انھوں نے آپ کے مضمون کی جو تائید کی ہے اس سے آپ کی اتنی نہیں جتنی میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اردو والے جس طور پر اُردو کو ایک غیر رضا مند طبقے یا خطے پر تھوپنا چاہتے ہیں اس کو میں کب پسند کرتا ہوں۔ آپ ایسوں کی مخالفت میں جو کچھ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں۔ بات سب صحیح کہی ہے لیکن بے موقع اور بے ضرورت کہنے سے فرق پڑ گیا ہے۔ اُردو کتنی ہی بے وقعت اور کس مپرس کیوں نہ ہو گئی ہو اس کی تائید کی جائے گی۔ چاہتا ہوں کہ اُردو سے آپ کی جذباتی ہم آہنگی قائم رہے۔ ہر موقع پر نہیں تو خاص خاص موقعوں پر ضرور جیسا کہ یہ تھا کبھی ملاقات ہوئی بتاؤں گا۔ آپ کا یہ مضمون کیسے کیسے لوگوں نے پسند کیا ہوگا اور ان کی bonafides کیا ہیں۔ سچ کڑوا ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ لیکن شخص یا فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ سچ کڑوا نہ معلوم ہو اور دل میں اُتر جائے۔ سچ کو کڑوا بنائے رکھنا کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے۔ خدا کا فرمان چاہے کڑوا ہوتا ہو لیکن وہی رسولؐ کی زبان سے گوارا ہو کر دل میں اتر جاتا ہے۔ ہم کو آپ کو رسالت مآبؐ کی پیروی کرنا چاہیے۔ بقیہ پھر کبھی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

اس صبح خط کے ساتھ آپ نے اپنے باغ کے خوش رنگ، خوشبودار اور خوب صورت لیموں بھیجے تھے۔ ایسے لمبوترے لیموں کو غالباً طب کی اصطلاح میں ترنج کہتے ہیں ان کو جب کبھی آپ نے مرحمت فرمایا۔ میرا ذہن بے اختیار غالبؔ کے مشہور شعر کی طرف گیا۔

تھا ترنج زر دیک خسرو کے پاس

کل بھی ایسا ہی ہوا۔ ہر شعر کو کوٹ کرنے میں اس لیے تامل ہوتا ہے کہ کہیں پہلے یہی بات نہ لکھ چکا ہوں اس طرح کے سانچے سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بلگرامی صاحب[1]، ڈاکٹر ضیار الدین والے مضمون کے پانچ reprints دے گئے بڑی خوشی ہوئی۔ ان پر ٹائیٹل پیج نہیں لگا ہے لیکن اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا کام چل گیا بہت بہت شکریہ۔

رشید احمد صدیقی

اس خط کو پڑھ کر فوراً تلف کر دیجیے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں ذرا سی غفلت سے یہ کتنے فتنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر یہ درخواست کر رہا ہوں۔

---

[1] شریف الحسن بلگرامی۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر فکر و نظر

۱۱۶

۲۴؍ستمبر ۱۹۷۱ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ تسلیم

آپ سے درخواست ہے کہ آج کلاس جاتے ہوئے وہ تحریر لیتے آئیں جس کے بارے میں کل شام گفتگو آئی تھی. تمام رات اسی طرف ذہن منتقل ہوتا رہا اور نیند نہیں آئی۔ میں اسے ہمدست واپس کردوں گا۔ صرف ان فقروں کو قلم زد کرنا چاہتا ہوں جن کو قلم زد ہونا چاہیے۔ آپ اسے ہرگز کسی اور بات پر محمول نہ کریں۔ آپ کا ہیچ ہو تو میں فکرمند نہیں ہوں گا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جب خلش دور ہوسکتی ہے تو اسے کیوں نہ دور کردیا جائے۔ بہت بہت شکریہ۔ قلم زد تحریر کردیے جانے کے بعد وہ تحریر بجنسہٖ واپس کردوں گا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

آپ ذرا دروازہ کھٹکھٹائیں گے میں آجاؤں گا۔ آپ کو انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

۱۱۷

جمعرات، ۲۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ[1]

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
عنایت نامہ موصول ہوا۔ آپ کی اصابت رائے اور دیرینہ اخلاص وکرم کا قائل ہوں۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے۔ حال ہی میں دورانِ گفتگو میں آپ نے اُردو پروفیسر کے تقرر سے متعلق ایک نہایت سچی اور اونچی بات کہی تھی یعنی کسی مسلم ادارے میں (مثلاً جامعہ ملیہ دہلی) اردو کا پروفیسر مقرر کیے جانے کے لیے پیشہ ورانہ استعداد اور زبان وادب سے متعلق اس کے اسناد اتنے ضروری نہیں ہیں جتنا اُردو سے اس کی وابستگی۔ آپ نے جن صاحب کا قول اپنی تحریر کی تائید میں نقل کیا ہے اس سے میں کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس لیے کہ انھوں نے جن حادثات کے context میں یہ بات کہی ہے وہ اُردو سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے لیے فی الجملہ سازگار نہ تھے۔

---

[1] یہ خط اور خط نمبر ۱۱۵ ایک ہیں۔ صرف چند سطروں کا فرق ہے۔

مشرقی بنگال میں جو قیامت برپا ہوئی اس کی فضا میں اُردو کے لیے کلمۂ خیر کہنا آج کل نہ مناسب ہے نہ ممکن۔

اردو والے جس طور پر اُردو کو ایک غیر رضامند طبقے یا خطے پر ٹھونسنا چاہتے بنگالی کو بے حیثیت کرنا چاہتے تھے اس کو میں کب پسند کرتا ہوں ایسوں کی مخالفت میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اپنی جگہ پر بالکل درست ہے۔ لیکن آج کل جن حالات کا سامنا ہے اس میں نہ کہتے تو بہتر تھا۔ اُردو کتنی ہی بے وقعت اور کس مپرس کیوں نہ ہو اس کی تائید کرنے والے اپنے کو بے وقعت نہیں سمجھتے۔ سمجھنا بھی نہیں چاہیے۔ چاہتا ہوں کہ اردو سے آپ کی وابستگی بہر حال قائم رہے۔ ہر موقع پر نہیں تو خاص موقعوں پر ضرور۔ سچ کڑوا ضرور ہوتا ہے لیکن بڑے شخص اور بڑے فن کار کا کمال یہ ہے کہ سچ کڑوا نہ معلوم ہو اور دل میں اتر جائے۔ سچ کڑوا بنائے رکھنا کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے۔ خدا کا فرمان چاہے کڑوا ہوتا ہو لیکن وہی فرمان رسولؐ کی زبان سے شیریں بن کر نکلتا ہے اور دلوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ ہم آپ کو اس معاملے میں رسالت مآبؐ کی پیروی کرنا چاہیے۔ اس رمز کو اقبال نے ہمارے رسولؐ کو بڑے اصرار سے بتایا ہے یوں بھی میرا خیال ہے کہ پیغمبر کے بعد کڑوے کو شیریں بنانے کا فرض پروفیسر پر عائد ہوتا ہے۔

آپ نے خط کے ساتھ اپنے باغ کے خوش رنگ، خوشبودار اور خوبصورت لیموں بھیجے تھے۔ ان کو جب کبھی آپ نے عنایت فرمایا میرا ذہن غالب کے مشہور شعر کی طرف گیا۔

تھا ترنجِ زر دیک خسرو کے پاس

اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا لیکن کوٹ کرنے میں یوں تامل ہوا کہ کہیں پہلے بھی یہی نہ کیا ہو اس طرح کے سانحے سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہمارے ہاں گرمی اور برسات میں دودھ کے بجائے لیموں ہی کام میں لایا

جاتا ہے لیکن ایسے تازہ اور رسیلے کہاں ملتے ہیں۔

بلگرامی صاحب ڈاکٹر ضیاءالدین احمد مرحوم والے مضمون کے پانچ reprints دے گئے، بڑی خوشی ہوئی۔ ان پر ٹائیٹل پیج نہیں لگائے گئے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا کام چل گیا۔ بہت بہت شکریہ۔

مکرر۔ اپنی بدحواسی سے نادم اور آپ کے کرم کا شکرگزار ہوں! [1]

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] جیسا کہ اس سے قبل فٹ نوٹ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ خط اور خط نمبر ۱۱۷ ایک ہیں ان کی شانِ نزول یہ ہے کہ میں نے یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کو میرا صفحہ (ہماری زبان) میں "کفارہ" کے عنوان سے جو مضمون مغربی پاکستان کے مشرقی پاکستان پر (موجودہ بنگلہ دیش) سیاسی و لسانی ظلم کے بارے میں لکھا تھا رشید صاحب اس مضمون کے لہجے اور خیالات سے متفق نہیں تھے۔ چند ہی روز بعد اس مضمون کی تائید میں خواجہ غلام السیدین کا مختصر سا مراسلہ مجھے موصول ہوا۔

عزیزی۔ تسلیم

میں نے یکم ستمبر "ہماری زبان" میں آپ کا مضمون "کفارہ" پڑھا مجھے مضمون اور اس کا طرزِ بیان دونوں بہت پسند آئے۔ بات کہنے کی تھی اور خوشی ہے کہ اس کو آپ نے مضبوطی اور سلیقے سے کہا۔

مخلص غلام السیدین

(۹ ستمبر ۱۹۷۱ء)

رشید صاحب کے مذکورہ بالا دونوں خطوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب کے اس خط کا ردِ عمل ملتا ہے جو میں نے ان کے ملاحظے کے لیے بھیج دیا تھا۔ پہلا خط لکھنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ وہ ایک عزیز دوست کے بارے میں قدرے سخت لہجہ اختیار کر گئے ہیں تو پیچھے سے ترمیم شدہ خط آیا اس ہدایت کے ساتھ کہ پہلا خط چاک کر دیا جائے۔

۱۱۸

۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
کل فکر و نظر کا ایک نسخہ مجھے ملا تھا۔ اس میں میرے مضمون (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد) کا ص ۳۴ - ۳۵ غائب تھا اور وہی سب سے ضروری تھا۔ حالاں کہ اس سے پہلے reprints کی پانچ کاپیاں موصول ہوئی تھیں اس میں یہ صفحہ موجود ہے۔

بلگرامی صاحب سے دریافت کرایا تو انھوں نے فکر و نظر کی ایک اور کاپی بھیج دی جس میں وہ صفحہ موجود تھا۔

معلوم نہیں بھید کیا ہے۔ فکر و نظر کے جتنے نسخے شائع ہوئے ہیں اس میں یہ صفحہ موجود ہے یا نہیں اور کیا اتفاق ہے کہ جو نمبر مجھے ملا اسی سے یہ صفحات غائب تھے۔

کل ساہتیہ اکیڈمی کا ایک رجسٹرڈ مراسلہ ملا جس میں انعام کے لیے کتابوں کی فائنل مجوزہ فہرست ہے اور کتابوں کے ذیل میں میری

وہ توسیعی نظام خطبات بھی ہیں جو دہلی یونیورسٹی میں غالب کی شخصیت و شاعری پر دیے گئے تھے۔ بڑا تعجب ہوا اس لیے کہ اردو سکشن کے جو اصحاب کرتا دھرتا ہیں وہ میرے۔ جتنے دوست ہیں وہ معلوم ہے، آج نہیں سالہا سال سے۔

نتیجہ جو ہوگا وہ معلوم ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کس نے اس خطبہ کو شامل کیے جانے کی سفارش کی۔ میرا ذہن تو رہ رہ کر آپ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ایسا محسوس ہوا جیسے انعام مجھ کو مل گیا ہو۔

کئی سال سے ساہتیہ والوں سے معذرت کرتا رہا ہوں اور آج بھی کروں گا کہ مجھے کتابوں کے انتخاب کرنے یا انعام کے لائق کتاب کی سفارش کرنے کے فریضے سے محفوظ رکھا جائے۔ تین چار سال سے زائد ہوئے کہ میں نے یہ فرض انجام نہیں دیا ہے اور نہ اب دوں گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۱۱۹

شنبہ ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل ہماری زبان[1] میں سرسید پر آپ کا مضمون پڑھا۔ دل بہت خوش ہوا۔ کتنے مختصر مضمون میں کتنی ساری باتیں آپ نے واضح کر دیں۔ یہ تحریر اور صاحبِ تحریر دونوں کی بہت بڑی صفت بتائی گئی ہے جو آپ کے حصے میں آئی اور برابر آتی رہتی ہے۔ موضوع پر مکمل عبور ہونے کے علاوہ لب و لہجہ میں اعتبار و اعتقاد کی جو زیریں لیکن طاقتور لہر ملتی ہے وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تقریر کو محفوظ کر لیا جائے اور جس کسی کو سرسید اور اس ادارے سے دوستی یا دشمنی ہو اس کو ضرور فراہم کیا جائے۔ خدا آپ کو اس طرح کی باتیں کہنے کرنے اور کرانے کے لیے تا دیر خوش رکھے۔ آمین۔

میں نے فرمائش کی تھی کہ فکر و نظر کی حالیہ اشاعت کا ایک

---

[1] ہماری زبان : ۲۲ ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

نسخہ ہدیتہً مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں بھیج دیا جائے
پروفیسر حبیب الرحمٰن، اردو ہال حیدر آباد کو بھی اس کا حق پہنچتا ہے۔
یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ ایشوع کس کس کو بھیجا گیا۔ عزیز احسن بتا سکیں
گے؟ اشاعت بڑھانے کی ذمہ داری کس، کے سپرد ہے؟ آپ کی
ادارت میں رسالہ آیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت
بھی بڑھے۔

امید ہے آپ خوش و خرم ہوں گے

مخلص

رشید احمد صدیقی

یوسف صاحب کو فکر و نظر کا نسخہ بھیجا وہ ایک طور پر فکر و نظر
کے بانی رہے ہیں۔

۱۳۰

۲۵ر نومبر ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

۲۱ر نومبر کے ہماری زبان میں آپ کا مضمون "لسانی انفرادیت کی تلاش" پڑھا۔ اُردو کے مسئلہ اور متعلقین کا آپ کا جائزہ اور تجزیہ حسبِ معمول بڑا عالمانہ ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے یہ مضمون عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اکثر خواص کے بھی نہ آئے تو عجب نہیں۔ بہت سے ایسے ہوں گے جو اس کے خواہش مند ہوں گے کہ ان کو بتایا جائے کہ اس سلسلے میں ان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے اگر دوسرے نمبر میں آپ ایک پروگرام بھی پیش کر دیں تو بہت اچھا ہوگا۔ مثلاً کن لوگوں کو کس سطح پر کہاں کیا کام کرنا چاہیے، اس سے دوسرے لوگوں کو والوں کو رہبری ملے گی اور ہمت افزائی بھی ہوگی یا پھر اس عنوان سے مفصل مضمون فکر و نظر کے لیے لکھ ڈالیے یہ سب سے بہتر ہوگا۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۲۱

۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
یہ رنگین پنسلیں حسب ذیل دو مقولوں کے ساتھ بھیجتا ہوں۔
(۱) اگر پدر نتواند پسر تمام کند
یا
(۲) اگر پسر نتواند پدر تمام کند

آپ کا
رشید احمد صدیقی

غالباً اس طرح کی پنسلیں دیکھ کر اقبال نے وہ شعر کہا ہوگا جو پورا یاد نہیں آرہا ہے۔ کچھ نیلے پیلے یادوں سے متعلق ہے۔[1]

---

[1] بالِ جبریل کی غزل کے ایک مصرع کی جانب اشارہ ہے ؎
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

۱۲۲

۱۵ دسمبر ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

یہ مضمون ملاحظہ فرمایئے۔ جلدی بالکل نہیں ہے۔ یہ ایک گونہ افتتاحیہ ہے۔ اس کے بعد عزیزانِ علی گڑھ سے خطاب کے اقساط ہوں گے جو بہت طویل ہو گئے۔ تقریباً سو صفحات۔ کسی وقت اسے بھی بھیجدوں گا۔ کچھ اور کرنے کو نہ ہو تو ان کو بھی دیکھ لیجیے گا۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ یہ اول سے آخر تک (افتتاحیہ سمیت) "فکر و نظر" میں شائع ہوں۔ ممکن ہے لوگ اکتاجائیں۔

بہرحال یہ تمام تر آپ کی صوابدید پر منحصر ہے کہ اس پر کیا کارروائی مناسب ہوگی۔ مجھے قطعاً عذر نہ ہوگا اور آپ جانتے ہیں کہ میں تصنع سے کام نہیں لے رہا ہوں۔

ہم رشتہ دو لفافے خود وضاحتی ہیں۔

سادے اوراق رکھ دیے ہیں۔

دعا ہے کہ آپ بالکل تندرست ہوں۔ کل سکندر سے اس کی تصدیق کر لی تھی۔ کبھی ملاقات ہوئی تو پھر گفتگو ہوگی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۲۳

۱۷ر دسمبر ۷۱ء

مسعود صاحب محترم - تسلیم

ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں 'میرا صفحہ'[1] کے تحت آپ کا مضمون پڑھا۔ ڈھاکہ یا بنگال کی آپ نے جتنی سچی اور دل کش مصوری کی ہے اس سے دل خوش ہو گیا۔ اتنا خوش کہ جی چاہنے لگا کہ جو کچھ ہوا وہ نہ ہوا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ تفصیل سے کچھ کہنے کی ان دنوں سکت نہیں بڑی خواری محسوس ہوتی ہے۔

آپ نے ڈھاکہ کا جیسا بدیع و بے مثل طبعی و تمدنی نقشہ کھینچا ہے اس میں شعر و ادب اور فنون لطیفہ سب کا بڑا دل کش نقش و رنگ ملتا ہے۔ ہر فن کا کمال یہی ہے کہ اس میں ہر فن کی کشید ملے۔ ظاہر ہے انشا پردازی بھی کوئی معمولی فن نہیں ہے۔ اس مضمون میں آپ کی تخیل اور فکر کی بڑی دل کش کشید و کشش ملتی ہے۔ اور خلاصۂ کلام میں تو آپ نے جیسے بنگال اور بنگالی دونوں کی تاریخ اور تقدیر کی وضاحت کر دی ہو۔ نمالی ہونے کا انجام یا ٹریجڈی اس سے بہتر فقرے میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ "وعید" بھی اسی طرح کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ اس طرح کے مضامین کبھی کبھی ضرور لکھ دیا کیجیے۔ یہ ذہن اور تخیل دونوں کو تازہ کار رکھتا ہے اور توانائی بخشتا ہے اور فن کار کو rigid and stale ہونے سے بچاتا رہتا ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈھاکہ: (یادوں کی غلام گردش میں)۔ ۵ر دسمبر ۱۹۷۱ء

۱۲۴

یکم جنوری ۷۲ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔

مسودہ اور نوازش نامہ ملے۔ طبیعت ناساز ہونے کے باوجود آپ نے جس توجہ سے مسودہ کا مطالعہ فرمایا اس کے لیے نادم بھی ہوں اور شکرگزار بھی۔ اللہ تعالیٰ صحت یابی بخشے اور سالِ نو مبارک فرمائے۔ آمین۔

آپ نے جہاں تہاں حاشیے پر جو نوٹس لکھ دیے ہیں وہ صاف پڑھے نہیں گئے۔ نوازش نامہ میں جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ بھی پورے طور پر سمجھ میں نہیں آئیں۔ سوچتا ہوں کسی وقت جو آپ کے لیے ناسازگار نہ ہو آدھ یا پون گھنٹے کے لیے آجاؤں تو ساری باتیں واضح ہو جائیں گی۔ ایسا فی الحال نہ ہو سکے گا تو دو چار روز بعد ہی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۲۵

۵ / جنوری ۷۲ء

مسعود صاحب محترم۔ آداب

کل جس افتتاحیہ یا تعارف پر گفتگو ہوئی تھی اسے مسترد کر دیا گیا۔ جو اجزا ص ۲۸ تا ۶۸ دے آیا تھا اس کا بقیہ حصہ ص ۶۹ سے ۹۲ تک آج بھیج رہا ہوں۔ اس طرح خطبہ ص ۲۸ سے ص ۹۲ تک محیط ہے۔ بیچ میں ۷۔ ۸ اوراق زائد ہیں۔ آپ کے پاس مکمل شکل میں پہنچ گیا۔ خیال آیا کہ پورا خطبہ آپ کے سامنے ہوگا تو رائے قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ اپنے notes علیحدہ کاغذ پر درج فرمائیے گا اس پر گفتگو ہو جائے گی۔ جلدی نہیں ہے لیکن چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی کھلنے سے پہلے آپ فارغ ہو جائیں تاکہ اس سے بہتر کاموں کی طرف توجہ مائل کر سکیں۔ اگر مناسب سمجھیے گا تو ایک پرزہ جامعہ[1] کے دفتر میں میرے نام بھجوا دیجیے تاکہ کس دن کس وقت آ جاؤں۔ مجھے مل جائے گا۔ شکریہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

[1] جامعہ اُردو۔ علی گڑھ

۱۲۶

۲۰ر جنوری ۷۲ء[1]

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

نوازش نامہ کل مل گیا تھا۔ کوئی جلدی تو ہے نہیں۔ جمعہ کو دس بجے دن کے بجائے اتوار دس بجے کیوں نہ رکھیے۔ تعطیل ہونے کی وجہ سے آپ کو فرصت اور یکسوئی ہوگی۔ میرے ہاں تشریف لانے کی زحمت نہ فرمائیے۔ میں خود آجاؤں گا۔ گھر سے باہر نکلنے کا کوئی تو بہانہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ ۱۵۔ ۲۰ منٹ صرف ہوں گے۔

ہماری زبان میں آپ کا مضمون بنگلہ دیش اور اردو سے متعلق پڑھ گیا۔ کچھ دنوں سے مشرقی پاکستان کے عروج وزوال کے سلسلے میں غریب اردو پر جناح صاحب اور عبدالحق صاحب مرحومین کے واسطے سے جیسی لعنت پڑ رہی تھی وہ سب ذہن میں تھا اس لیے پڑھنے کا جی نہ چاہا۔ لیکن چوں کہ آپ نے لکھا تھا اس لیے پڑھنے پر اپنے آپ کو آمادہ کرلیا۔ مضمون کا آخری حصہ آپ نے جس note پر ختم کیا ہے اس سے دل بہت خوش ہوا۔ بڑا آدمی وہ ہے جو خوف اور مایوسی میں نہ تو خود خائف اور مایوس ہو نہ دوسروں کو مرنے دے۔ آدمی کی تخلیق خوف اور مایوسی پر نہیں ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] میرا صفحہ: ۱۵ر جنوری ۷۲ء

۱۲۷

شنبہ ۸/ اپریل ۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

مسعود صاحب مکرم۔ سلام شوق

میرے صفحہ کے تحت ہماری زبان میں آپ کا مضمون[1] نظر سے گزرا۔ آپ نے اُردو کے نقشے اور فیصلے پر جیسی نظر ڈالی ہے اور جیسا تجزیہ جس تفصیل اور وضاحت سے کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ یعنی بہت ہی اچھا۔ لیکن آپ کا کام محض فرض شناسی کا نہیں ہے کہ اپنی رپورٹ مریض کو دے دی یا اس کے معالج کو دے دی اور کام ختم ہو گیا۔ آپ معالج بھی ہیں اور تیمار دار بھی۔ آپ یہ بھی بتائیں کہ صحت اور توانائی کی بازیافت کی یہ تدابیر ہیں جس پر سب کو عمل کرنا پڑے گا۔ آپ کا یا میرا کام اتنا نہیں ہے کہ نعش کو چیر پھاڑ کر دریافت کریں کہ موت کیوں کر واقع ہوئی۔ پیتھالوجی اور اناٹمی یا تغذیہ (علم غذا) کو مدنظر رکھ کر پرہیز، غذا، تفریح، چلنا پھرنا سب تجویز کرنا پڑے گا۔ ہماری زبان کے اس شمارے میں

---

[1] میرا صفحہ: "اردو ایک ہرجائی" ۱۵/ اپریل ۷۲ء

اداریہ کے تحت معقول باتیں کہی اور تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ اور دوسرے احباب ایک پروگرام مرتب کر دیں جن میں تفصیل سے یہ درج ہو کہ کن اور کیسے لوگوں کے ذمے کس طرح کا کام ہونا چاہیے تاکہ اُردو کے تحفظ و ترقی کا ایک سونچا سمجھا متفقہ پروگرام مختلف محاذوں پر کام میں لایا جا سکے۔ مثلاً سیاسی، تعلیمی، علمی، صحافتی، تصنیفی اور سب سے اہم مشاعرہ اور فلم کا۔ مشاعرہ مختلف انداز کی شاعری کا اتنا نہ ہو جتنا روایتی غزل کا جو کتنی ہی بدنام کیوں نہ ہو، اب بھی قبولِ عام ہے۔ ہر محاذ اور پروگرام کے تجربہ کار اراکین اپنے حلقہ میں اردو کا کام بہترین طور پر انجام دے سکیں گے۔ وغیرہ۔

بقیہ آپ جانیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۲۸

شنبہ ۸ر اپریل ۷۲ء
ذاکر باغ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

شاعر بمبئی میں آپ کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ "بعنوان "اردو زبان اور اس کے رسمِ خط" کا مسئلہ نظر سے گزرا جو ۱۹۷۱ء میں یونیورسٹی کے کسی انگریزی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ خوب ہے۔ ایسے مختصر مضمون میں اُردو کے مسئلے پر آپ نے جتنی اور جیسی باتیں واضح کر دی ہیں کوئی اور اس کو پوری کتاب میں مدتوں نہ سمیٹ سکتا۔ نہ کہیں حشو زوائد ہیں۔ نہ سب و شتم، نہ بے دلی یا بیزاری۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ دور میں اردو کے ہر طالب علم اور بہی خواہ کو یہ مضمون اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے اس سے صحیح صورت حال کا اندازہ اور سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کا طریقہ واضح ہوتا ہے۔ ایسا مختصر اور جامع و مانع مضمون (اردو کے مسئلے پر) مشکل سے کہیں اور نظر آئے گا۔ آپ ہم سب کی تہنیت کے مستحق ہیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

لے انگریزی میں یہ مضمون علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے جرنل میں اسی سال شائع ہوا تھا (دی پرابلم آف اُردو)

۱۲۹

۲۷ر اپریل ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

میرے خطبہ کی بندش توڑنی ہی پڑے گی اس لیے کہ ایک ہی مضمون کو کئی کمپوزیٹرس کمپوز کرتے ہیں۔ اس لیے اوراق کو جلدی سے علٰحدہ سے کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی کمپوزیٹر بھی ہو تو وہ کسی طرح سو سوا سو کی جلد کو handle نہیں کرسکتا۔ ایک وقت میں ایک علٰحدہ ورق مناسب رہتا ہے۔ آپ کلاس جاتے ہوئے ایسا اندازہ لگائیں کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میرے ہاں صرف کرنے ہیں۔ اس میں بندش توڑ کر ضروری اوراق اور حصص علٰحدہ کر لیے جائیں گے اور ان اوراق پر نئے صفحے ڈال دیے جائیں گے پھر چاہے جتنے کمپوزیٹرس کام کریں۔ کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہوگی اور پوری جلد بھی soiled ہونے سے محفوظ رہے گی۔

دوسرے یہ کہ آپ نے خطبہ کے وہ اوراق بھی ملاحظہ فرما لیے ہوں گے جو سرور صاحب نے آپ کی خدمت میں میری طرف سے پڑھنے کے لیے بھیج دیے تھے اب وہ سرور صاحب کے پاس ہیں اور تقریب میں شاید ذوقی صاحب[۱] پڑھ

---

[۱] مسعود علی ذوقی صاحب، سابق لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دیں۔ کیا وہ بحث ایسی نہیں ہے جو فکر و نظر کے مجوزہ شمارے کے لیے موزوں ہو۔ مجھے اصرار بالکل نہیں ہے صرف یاددہانی کے طور پر عرض کر رہا ہوں ورنہ واقعہ یہ ہے کہ میری خواہش یہی ہے کہ وہ اوراق شامل کیے جائیں جس کا ذکر کل شام کر چکا ہوں۔ یعنی غالب، حالی اور اقبال سے متعلق۔

آپ بغیر دستک دیے بے تکلف گھر میں آجائیں۔ بیوی ایک تقریب کے سلسلے میں بھوپال گئی ہیں۔ کمال اپنے ڈپارٹمنٹ جا چکے ہوں گے۔ "خانۂ خالی" صرف میری گرفت میں ہوگا۔ پندرہ منٹ سے زیادہ اوراق کو علٰحدہ کرنے اور علٰحدہ منسلک کرنے میں صرف ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۰

۲۲ر مئی ۷۲

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

یہ چیز بے بتائے دفعتاً نازل ہوئی اور میری عدم موجودگی میں رکھ لی گئی اس لیے واپس کرنے میں محصول ڈاک کی ایک بڑی رقم بطور تاوان مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

آپ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ یونیورسٹی بند ہو جانے کے بعد غالباً (گرمی دیکھتے ہوئے) گھر میں "قلعہ بند" ہوں گے۔ کاش جوانانِ ملت کے ساتھ نعرے لگاتے ہوئے میری طرف آ نکلتے لیکن کیسے کہوں رات تو گرمی کا یہ عالم تھا کہ ایک پرانے شاعر کا مصرعہ یاد آگیا۔

آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے

دیباچہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان اوراق میں کیسے کیسے کرامات ملفوف ہوں گے۔ آپ ہوں نہ ہوں تو کسی وقت آجاؤں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۳۱

شنبہ ۲۷ مئی ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

ہماری زبان کے ۲۲ مئی ۷۲ء کے شمارے میں آپ کا مضمون "میرا صفحہ" سامنے ہے ۔ اُردو کے سیاسی اور سماجی مسائل پر آپ کے مضامین بڑے واضح اور دل نشین ہوتے ہیں ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر سطح کے لوگوں کی سمجھ میں آجاتے ہیں ۔ انجام کیا ہوتا رہتا ہے اس کے اسباب دوسرے ہیں اور ہماری آپ کی دسترس سے تقریبًا باہر ۔ ایک بات جو ممکن ہے وہ یہ کہ ان مضامین کی اشاعت کثرت سے ہو اور مسلسل ۔ اس کا اثر دیر میں ہوگا لیکن ہوگا بڑا پائیدار ۔ یہ مضمون اور ایسے مضامین اردو کے اچھے اخبار اور رسائل میں کچھ دنوں اسی طرح شائع ہوتے رہیں تو اردو کی بڑی اچھی وکالت ہوگی ۔ مقدور ہوتا تو قیمت ادا کر کے اس مضمون کو اردو اخبارات میں شائع کراتا رہتا جس طرح اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن اس سے اطمینان ہے کہ جو کچھ میری قدرت میں ہے وہ مختلف کرنسی میں آپ کرتے رہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور اطمینان بخشے کہ آپ ایسا کرتے رہیں ۔ آمین ۔

لہ میرا صفو: یہ یادہ؟

اب چند دنوں کے مہمان ہیں۔ ان کی بہارِ جانفزا دکھانے کے دن تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو غنچے بِن کھلے مرجھانے لگے ہیں اور آپ کے زیرِ نظر مضمون کے بعض فقرے برجستہ ہیں۔ خلوص نہ ہو تو یہ نہیں آتے۔

پرسوں آپ تشریف لائے لیکن اتفاق سے کچھ ایسا ہو گیا اور بحث ایسی چھڑی کہ کیا کہوں۔ ایک تو موسم خراب دوسرے موضوعِ بحث اور اندازِ گفتگو نے اس کو اور زیادہ Sullen and Sultry کر دیا۔ میں اس موضوع پر بحث کرنے اور سننے دونوں سے ہمیشہ بچنا چاہتا ہوں لیکن اس میں ضرور ناکامی ہوتی ہے بالخصوص اس لیے کہ بدنصیبی سے صدرِ محفل میں ہوں۔ معلوم نہیں ایسے پیشتار رے سے آپ کہاں تک بدحظ ہوئے۔ آپ سے خاص طور پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے lockandbarrel سے مطمئن نہیں ہوں۔ کچھ اس طرح کی کیفیت ہے کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں۔ ہو تو کیوں کر ہو! خدا حافظ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۲

۱۳؍ مئی ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

آپ کا عطیہ عاشور نامہ موصول ہوا۔ گرامی نامہ بھی۔ شکریہ۔ خدا آپ کے اس کام اور ایسے کاموں میں برکت اور شہرت دے۔ یہ دعا میری ہو یا کسی اور کی آپ کے لیے بہت پہلے مقبول ہو چکی ہے اس کے بعد دعا مانگنا اس امر کی شہادت ہے کہ آپ کے لیے میرا وظیفہ ''دعا گفتن'' لاشعور تک پہنچ چکا ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ قدیم اردو پر تعداد اور استناد کے اعتبار سے آپ کی خدمات سب سے زیادہ بھی ہیں اور سب سے وقیع بھی۔ یہ دیکھتے ہوئے اور یہ کہ آپ عمر میں اپنے پیشروؤں سے کہیں کم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا ماہر لسانیات ہونا اس طرح کے کاموں کا محرک اعظم ہے اور شاید اس طرح کے کاموں سے دل چسپی آپ کے ماہر لسانیات ہونے کا باعث ہو۔ آپ کا دونوں سے شغف اردو کے لیے نہایت مبارک فال ہے۔

میرے آلام و آزار کی فکر نہ کیجیے۔ اس عمر اور صحت میں اس سے

زیادہ سہنا پڑتا ہے البتہ اس سے تکلیف ہوتی ہے اور شرمندہ ہوتا ہوں کہ یہ تکالیف سکت سے آگے بڑھ کر ساتھیوں کی راحت وعافیت میں خلل انداز ہوتی ہیں اور اپنے جتنے کام پہلے خود کر سکتا تھا اب اس کا بار دوسروں پر پڑے گا۔ از کارِ رفتہ بوڑھوں اور مریضوں کا تندرست اور خوش وخرم عزیزوں پر بار ہونا اور گھر کی فضا کو بوجھل اور دھندلا رکھنا بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ چوں کہ تمام زندگی ایسی درماندگی کبھی پیش نہیں آئی اس لیے اس کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔

ہاں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ پشتارہ آپ کو مل گیا یا نہیں جو کچھ دن ہوئے پہلوان کی معرفت آپ کی خدمت میں بھیجا تھا اور اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ آپ کے کسی خط میں اس کا ذکر نہ تھا اس لیے دریافت کرنا پڑا۔

خطبات کا مسودہ اپنے ہی پاس رہنے دیجیے وہاں زیادہ محفوظ ہوگا جب ضرورت ہوگی منگالوں گا۔ ۱۵ ۔ ۲۰ اوراق اور بھی ہیں ان کو بھی بھیجدوں گا۔ مسودہ مناسب جگہ دے دیجیے گا۔ فکر ونظر ابھی پڑھ نہ سکا۔ آنکھیں بھی جواب دینے لگیں۔ اس لیے لکھنے پڑھنے کا وقت گزاری کا جو شغل تھا وہ بھی تیزی سے محدود ہوتا جا رہا ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لیے آنکھوں سے اجازت لینی پڑتی ہے اور وہ دیر میں اور مشکل سے ملتی ہے اس لیے کبھی کبھی عدول سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ حالیہ فکر ونظر کی پذیرائی کیسی ہوئی؟ یونیورسٹی بل کی بشارتیں دیکھ لیں۔ کوئی امید افزا بات کہیں سے سنائی نہیں دیتی۔ اللہ کی مقہور

قوم کے فروغ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بندوں کی مقہور قوم (ہم مسلمانوں کو) بھی نظر میں رکھیے۔ اس کے بعد ہندوستان کے بدنصیب مسلمانوں کو کیا کہیں۔ کس کس کی اور کہاں کہاں کی کرنی ہم سب کو بھرنی۔

میاں جاوید کس عالم میں ہیں اور اپنے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ خدا ان کو قبیلے کی آنکھ کا تارا بنائے اور رکھے۔ آمین۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۳۳

۱۶ر جون ۷۲ء

ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ کل ملا اور ایسی ہی خوشی ہوئی جیسے کسی کاہل الوجود کو ہو سکتی ہے۔ شام ہوتے ہوتے کرفیو بھی نافذ ہو گیا۔ ادھر یونیورسٹی بل کے سلسلے میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کی بقول آپ کے دھمک اب شروع ہوئی ہے لیکن اس کی بھنک بہت پہلے سے مل رہی تھی اب دھماکے کا انتظار ہے۔ زلزلے کے یہی لوازم ہیں۔

حادثہ سخت ہو یا جان عزیز۔ رعایت لفظی ہم آپ سے نہ چھوٹے گی! مسعود صاحب ایک بات کہتا رہا ہوں اور کہتا رہوں گا کہ ہم جس متاع کو عزیز رکھتے ہیں یا اہم کو رکھنا چاہیے، اس کی وکالت، حمایت اور حفاظت سے باز نہیں آسکتے۔ فرد کا یہی مقام ہے۔ یہی فرد مردِ مومن کہلاتا ہے۔ یہ لڑائی حق کے لیے لڑی جاتی ہے۔ ہارنے جیتنے کے لیے نہیں۔ اس کا انجام یا انعام شہادت اور سعادت ہوتا ہے جس کے لیے زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں اس کے لیے مرنے میں کیا ہرج!

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ کچھ اور باتیں بھی تھیں لیکن اُن کو کسی فرصت کے لیے ملتوی کرتا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۴

۱۵ر جون ۷۲ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
یورپ کی ایک مثل ہے "بیٹھا بنیا کیا کرے، اس کوٹھی کا دھان اس کوٹھی کرے" یہی حال میرا ہے کچھ کرنے کو نہیں تو خیالات ہی کو ادھر اُدھر کرتا رہتا ہوں۔ اس میں چالیس صفحے اور ہو گئے۔ اس تعطیل میں معلوم نہیں آپ کتنے آفات ارضی وسماوی کی زد میں ہوں گے ان میں ایک میں بھی ہوں۔ کرفیو منڈلا رہا ہے اور منڈلاتا رہتا ہے۔ سامان صد ہزار نشکنجے کیے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ قافیہ وزن میں ہے یا نہیں۔ گھر میں نظر بند رہ کر ایک نظر ان اوراق پر ڈال لیجیے۔ شکر گزار ہوں گا۔ آپ اس درجہ مصروف رہتے ہیں کہ آپ کے پاس وقت کی کمی ہی ہو گی، کبھی جامع المتفرقین ملائیے گا تو مزید گفتگو ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ ملفوفہ اوراق کو آپ کتر بیونت کر کے فکر و نظر کے شعار و معیار کا بنا سکیں گے اور ان کی پذیرائی خاطر خواہ ہو گی۔ ممکن ہے کہ آپ کو یہ نزاکت محسوس ہو کہ اتنا معاوضہ ایک ہی شخص کو ایک ہی مضمون پر دینا مصلحت اندیشی کے خلاف ہو۔ یہ بھی صحیح ہے لیکن میرا آفر یہ ہے کہ

میں معاوضہ کو بالکل ہی نظر انداز کرتا ہوں ۔ مجھے یہ رقم قطعًا درکار نہیں ۔ خواہش صرف اتنی ہے کہ خطبہ کا زیادہ حصہ فکر و نظر میں شائع ہو جائے ۔ اس لیے کہ اس خطبہ کا کہیں اور چھپنا نہ ممکن ہے نہ مناسب ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکے تو آپ مطلق تردد نہ کریں ۔ کسی دوسرے وقت اور موقع کا انتظار کروں گا ۔

ایک بات پوچھنا ہمیشہ بھول جایا کرتا ہوں وہ یہ کہ ساہتیہ اکاڈمی کے اوارڈ کے لیے میرا نام اور نظام خطبات کس نے پیش کیا تھا ؟ آپ نے ؟ فکر و نظر وقت پر آ گیا ۔ یا ایک آدھ نمبر ابھی پیچھے ہے ؟ شکریہ ۔

ص ۱ سے ۶ تک میں جو تجویز پیش کی گئی ہے ۔ چاہتا ہوں کہ موجودہ حالات میں وہ جلد سے جلد علی گڑھ کی طرف سے پبلک کے سامنے آ جائے ۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۱۳۵

۳۰ جون ۷۲ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

میری خواہش ہے (لیکن آپ کے صوابدید کو ہر حال میں ترجیح ہوگی) کہ فکر و نظر کی آئندہ اشاعت میں خطبے کا وہ حصہ شائع فرمائیں جو غالب، حالی، اکبر اور اقبال سے متعلق ہے اور آپ کی تحویل میں ہے۔ اس میں شکل سے ۲-۱ صفحہ کا اضافہ کروں گا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ اس کا حجم کیا ہے۔ قیاس ہے کہ شاید ۲۰-۲۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہو۔

دراصل چاہتا تو یہ تھا کہ علی گڑھ تحریک ثانی والی تجویز جلد لوگوں کے سامنے آجاتی لیکن فکر و نظر کے صفحات محدود ہیں اس لیے مجبوری ہے۔ ایک طرح کی تعمیری اور اصلاحی تحریک علی گڑھ کے محاذ سے پیش ہو جاتی تو موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے مناسب حال ہوتا۔ غیر مساعد حالات کو counter (کرنے) کے لیے کچھ کرنا

ضروری ہے۔

ابھی تو فکر و نظر کے چھپنے میں دیر ہے۔ اگر آپ کو میری تجویز پسند ہے تو کسی وقت غالب، حالی، اکبر اور اقبال سے متعلق اوراق بھیجد بھیجیے گا اس پر نظرِ ثانی کر لوں گا...... کی کتاب ...[۱] پر اسلوب[۲] صاحب کا ردِ عمل بہت سخت ہے وہ اسے خبثِ نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کسی کام سے دور دراز کا سفر چند دنوں کے لیے اختیار کرنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سفر میں کتاب غور سے پڑھیں۔ میں نے آپ کی طرف سے اجازت دے دی ہے، کتاب محفوظ ہے۔ دیر یا سویر سے آپ کو مل جائے گی۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱ے یہاں نقطے رشید صاحب نے چھوڑے ہیں۔

۲ے پروفیسر اسلوب احمد انصاری، شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۳۶

۴/۷/۷۲

مسعود صاحب محترم ۔ آداب

اپنے پچھلے خط میں عرض کر چکا ہوں کہ فکر و نظر کی آئندہ اشاعت میں خطبہ کا وہ حصہ شائع کیا جائے تو مناسب ہو گا جو غالب، حالی، اکبر اور اقبال سے متعلق ہے۔ اس حصے کے آخری اوراق میں وہ واقعہ آگیا ہے جو اکبر کے چار اشعار اور ذاکر صاحب کی کالج سے علیحدگی سے متعلق ہے اور کچھ اشارہ جامعہ ملیہ کی طرف بھی ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس حصہ کو آپ چند دنوں کے لیے واپس کر دیں تو میں ان پر نظر ثانی کر دوں جن کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ان اوراق کے چھپنے کی نوبت ابھی کچھ دنوں میں آئے گی۔ تین اوراق مزید بھیجتا ہوں۔ یہ علی گڑھ تحریک ثانی کا تتمہ ہیں ان کو شامل کر لیجیے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حال میں جو مفاہمت ہوئی ہے۔ کاش اب سے بہت پہلے ہوئی ہوتی۔ کتنی خواریوں، ہلاکتوں اور محرومیوں سے نجات رہتی۔ عقل کتنی آسانی سے اور کتنا جلد ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور کیسے کیسے دردناک تاوان لینے کے بعد واپس آتی ہے۔

اللہ ہم کو عقل، سلامتی اور شرافت کے راستے پر رکھے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۷

جمعرات، ۶ر جولائی ۱۹۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

مضمون کے چند اوراق اور نوازش نامے ملے تھے۔ اوراق پر نظرِ ثانی کر کے واپس کرتا ہوں۔ انھیں اوراق کے آس پاس حالی پر مضمون ملے گا۔ ایک جگہ اس میں کچھ اضافہ کرنا ہے۔ اس کے بعد جلد اور بجنسہٖ واپس کردوں گا۔

فکر و نظر کے کس شمارے میں کتنے اوراق اس خطبے کے اور کس بحث سے متعلق کب شائع کیے جائیں گے اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ یہ بات کلیتہً آپ کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہیں۔ جو چاہے کیجیے گا۔ ملفوفہ کتاب اور اس پر اسلوب صاحب کے کچھ ریمارکس آپ کو مل گئے ہوں گے۔ کل شام بھجوائے تھے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۸

۶راگست ۷۲ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
نوازش نامہ ملا۔ لکھنؤ کے معرکے[1] میں آپ نے جو باتیں جس طرح کہی ہوں گی۔ ان کے وزن اور وقعت کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ اس اعتبار سے اس کے ردِعمل کا بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

میرے مضمون کا عنوان وہی رہے گا جو آپ کی رائے ہے۔ یعنی "عزیزانِ علی گڑھ"! شکریہ۔

پچھلے مضمون کے reprints کا بل اب تک نہیں آیا۔ بھجوا دیجیے انتظار ہے۔ لکھنؤ میں کمیشن کے سامنے آپ نے جو بیان دیا ہے وہ پڑھنے کو مل سکے گا؟

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] گجرال کمیٹی کے سامنے میرے بیان کی جانب اشارہ ہے۔

۱۳۹

شنبہ۔ ۲۹ راگست ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
امید ہے کہ میرا خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ عرض کیا تھا کہ مجھے آپ کے اس خیال سے کلی اتفاق ہے کہ آئندہ اشاعت میں میرا مضمون فکر و نظر میں آئے گا اس کا عنوان بدلا نہ جائے گا۔ "عزیزانِ علی گڑھ" نمبر ۲ ر ہے نہ کہ "علی گڑھ تحریک ثانی"۔
دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ کسی طرح محولہ بالا مضمون گھنٹے بھر کے لیے مجھے مل سکتا ہے۔ ایک آدھ جگہ نظرِ ثانی کر دینی ہے۔ ایک آدھ فقرے شامل کرنے ہیں اور اتنے ہی حذف کر دوں گا۔ کمپوزیٹرس کے کام میں حرج واقع نہ ہوگا۔ آپ جہاں چاہیں گے میرا آدمی فوراً پہنچا دے گا۔ آپ کا دفتر کہاں ہے؟ تاکہ اسی کو contact کروں۔ اگر آپ کی مرضی ہو۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۴۰

۲۶ اگست ۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں آپ کا مضمون[1] نظر سے گزرا۔ ہندوستانی اکیڈمی میں ہندی کے جس ممبر کے بیان کا حوالہ دیا ہے اس کا ایک چشم دید گواہ میں بھی ہوں۔ اکیڈمی کے اس اجلاس کے بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ تقسیم ملک کے بعد جس اولین میٹنگ میں یہ واقعہ پیش آیا اس میں آپ تھے یا نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ سید ضامن علی مرحوم اور مولانا عبدالماجد دریا بادی موجود تھے اور میں نے ہی یہ کہا تھا کہ جب تک ہندوستانی اکیڈمی ہندوستانی کہلائے گی۔ اس وقت تک اردو اور ہندی کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ نام دونوں کو یکجا کرنے اور رکھنے کے لیے ہی مقرر کیا گیا تھا۔ اس پر ایک صاحب جو شاید ریاستی مجلس واضعانِ قانون کے ممبر تھے کچھ اس انداز سے تالی بجا کے انگلیاں مٹکا کے اور ایسے لب و لہجہ میں یہ فقرہ کہا تھا کہ کیا کوئی اور کرے گا یا کہے گا۔ اجلاس کے صدر ہائی کورٹ کے کوئی ر

---

[1] میرا مضمون: اردو کا المیہ۔

جج تھے ان سے رجوع کیا گیا تو کیا بتاؤں کہ ان کا انداز کیا تھا
اتنا کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ نہ جج کی شایانِ شان تھا نہ اکیڈمی
کے۔ اجلاس کے صدر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سید ضامن علی اور مولانا
عبدالماجد اور دوسرے حضرات جو اُردو کے نمائندے تھے اس طرح
سر اور نظر نیچی کیے ہوئے تھے۔ جیسے ان کے ایک ساتھی سے بڑی
ہی بے عزتی کی بات سرزد ہو گئی تھی! میرے علٰحدہ ہو جانے کے بعد
غالباً آپ یونیورسٹی کے نمائندہ ہوئے تھے اور آپ کے ساتھ
بھی یہی حادثہ پیش آیا۔

اس مضمون میں آپ کا وہ crisp and poignant ساتھ ہی ساتھ
علمی و ادبی انداز پہلے کی طرح نہیں ملتا۔ ایسا تو نہیں کہ اُردو کے
cause سے مایوس ہو گئے ہوں۔ یہی وقت نبرد آزمائی کا ہے۔ تعداد
کی فکر مت کیجیے۔ یکے مرد جنگی بہ از صد ہزار!

اُردو کی محافظت پر آپ "مامور" من اللہ بھی ہیں اور عنداللہ
بھی۔ طبیعت اچھی نہیں ہے ورنہ کچھ اور بھی عرض کرتا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۴۱

شنبہ ۹ ستمبر ۷۲ء

مسود صاحب مکرم. تسلیم

لفافہ واپس ہے اس میں تو بڑا کام رفو کا نکلا۔ بروقت یا بے وقت۔ آپ کی مدد شاملِ حال نہ ہو جاتی تو میں اس جھنجھٹ میں کبھی نہ پڑتا۔ میں نے نشانات لگا دیے ہیں۔ ہدایتوں پر ایک نظر ڈال جایئے گا۔ حوالہ جات کا خاص طور پر لحاظ رکھیے گا۔ ایک نظر ورق گردانی ضرور کر جایئے گا۔

بہت بہت شکریہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۲

اتوار، ۱۷ دسمبر ۷۲ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم. تسلیم

فکر و نظر کی تیسری سہ ماہی کا ایشوع اور میرے مضمون کے ۲۵ ریپرنٹس چند دن ہوئے ملے تھے۔ بہت بہت شکریہ۔ اب اس سال کا آخری شمارہ رہ گیا ہے۔ خطبات کا آخری حصہ (تقریباً ۴۵ صفحات آپ کے پاس ہیں)، یہ اقبال، حالی اور اکبر کے کلام کی مخصوص اہمیت سے متعلق ہے اور زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ طالب علموں کے ذہنی، علمی اور اخلاقی تہذیبوں کی اصلاح اور استواری کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ اگر یہ اوراق شائع کیے جا سکے تو میرا خیال ہے کہ ان کو کوئی بے ضرورت یا ناقابلِ التفات نہ سمجھے گا۔ مجھے اطمینان اور خوشی ہوگی کہ باوجود طرح طرح کی معذوریوں کے آپ کے غیر معمولی تعاون اور توجہ کے سہارے اس ادارے کی حمایت و حفاظت میں کچھ کہہ سکا۔ مضمون طویل ضرور ہے لیکن آپ چاہیں گے تو فکر و نظر کے دامن کو آسانی سے اتنا کشادہ کر سکیں گے جو سارے رسالے کے مفید اور مقبول ہونے اور رکھنے میں معین ہو۔

اس خطبے کے ابتدائی ۳۰ - ۳۵ صفحات کے شائع کیے جانے کی کوئی اور سبیل کروں گا۔ مجھے آپ کے اس خیال سے پورے طور پر اتفاق ہے کہ فکر و نظر میں کوئی ایسی بات شائع نہ ہونی چاہیے جس میں اس ادارے اور اس کے منتظمین کو کسی طرح کی دشواری میں مبتلا ہونے کا امکان نکلتا ہو۔ اکثر اس امر کا بھی اعادہ کر چکا ہوں کہ مضمون کے معاوضے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اگر اندیشہ ہو کہ لوگ آپ پر پاسداری کا الزام لگائیں گے کہ میرے لیے زیادہ صفحات وقف کیے گئے تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ اخراجات کی تلافی اس معاوضے کی رقم سے کر دی گئی جو مجھے دی جانے والی تھی۔ لیکن یہ گفتگو اسی وقت قابلِ لحاظ ہو گی جب مضمون معیاری ہو۔ دوسرے اور تیسرے درجہ کے مضامین کے لیے یہ دلائل دور از کار ہیں۔ اگر آپ تیسری قسط چھاپنا نامناسب نہ سمجھتے ہوں تو ان اوراق کو میرے پاس بھیجد بھیجے گا میں ان پر ایک نظر ڈال لوں گا۔ اس سے وہ اور بہتر ہو جائیں گے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۳

جمعہ ۲۲؍ستمبر ۷۲ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

پچھلے خط میں کچھ باتیں عرض کی تھیں۔ فکر و نظر میں اپنے خطبات کے ایک حصہ کی اشاعت کے بارے میں کہاں تک وہ قابلِ قبول یا اس کے برعکس پائی گئیں۔ خیال تھا کہ اگر وہ چھپنے کے لائق ہیں تو فکر و نظر کے آخری سہ ماہی میں شائع کردی جائیں۔ سلسلہ منقطع ہو جانے سے اور کبھی آئندہ چھپنے سے ان کا اثر زائل ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب باتیں پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں۔ اس بارے میں میری درخواست ہے۔ مطلق کوئی نزاکت نہ محسوس فرمائیں یہ میرے لیے تکلیف دہ بات ہوگی جو میں کسی قیمت پر گوارا نہ کرسکوں گا۔

خیال تھا کہ اگر وہ اجزا چھپنے والے ہوں تو دو چار روز کے لیے میرے پاس بھیج دیے جائیں جہاں تہاں سے ان کو اور بہتر بنانے کی کوشش کروں گا۔

آپ ان دنوں کہیں باہر تو تشریف نہیں لے گئے تھے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

جہاں تک لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے فکر و نظر میں خطبے کے یہ اقتباسات پسند کیے گئے۔

۱۴۴

بدھ، ۱۱ اکتوبر ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

(۱) آپ کے اسسٹنٹ کے بارے میں بالآخر کیا طے ہوا؟
(۲) فکر و نظر کے تحقیقی یا غیر تحقیقی رکھے جانے کے سلسلے میں کیا ہوا؟
(۳) فکر و نظر کی آخری سہ ماہی شمارے کے حجم کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ کم و بیش سو صفحات کا ہوگا۔ میرے مضمون کے بارے میں آپ نے مشورہ دیا تھا کہ ۴۰ کے بجائے نصف یعنی ۲۰ صفحے کا کر دیا جائے وہ میں نے کر دیئے۔ آپ نے یہی فرمایا تھا: جب طلب کیجیے گا حاضر کردوں گا۔ میرا مضمون حسب معمول رسالے کے آخر میں ہوگا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۴۵

۱۸ اکتوبر ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

دعوت (دہلی) میں آپ کی تقریر زبان دہلوی کا خلاصہ نظر سے گزرا۔ اچھی رپورٹنگ تھی۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب علم وفن میں کس قدر مقبول ہوئی ہو گی۔ مبارک ہو۔

آپ کے مضامین یا تصانیف پر کسی حلقے میں کسی سطح پر سوا تعریف کے اب تک کچھ اور بات سنی نہ پڑھی۔ یہی بات یوسف صاحب کی تحریروں میں بھی پائی۔ ذاکر صاحب کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں۔

بعض اصحاب سے کل سر سید ڈے کے موقع پر آپ کی مختصر تقریر کی بھی بڑی تعریف سنی اور ایسے لوگوں سے سُنی کہ جو نہ آپ سے بہت زیادہ واقف تھے نہ سر سید سے۔ یہ اور ایسا خراجِ تحسین بڑا بیش قیمت ہوتا ہے۔ گجرال کمیشن کو انجمن نے جو یادداشت پیش کی تھی اس کا اُردو ترجمہ اور اس پر آپ کا اداریہ بہت اچھا رہا۔ اُردو کی بیوگی کا استعارہ ذرا طویل ہو گیا۔ شعر و ادب ہو، زندگی ہو، رنج و راحت کے مواقع ہوں مجھے "بیوگی" کا استعارہ یا strain اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں متداول مرثیہ کو بھی شامل کرتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا اس بارے میں

اکثر میں نے آپ کو ٹوکنے کی جسارت کی ہے۔

سرسید ڈے کے سلسلے میں ایک خیال اکثر آیا کہ اس موقع پر آپ سرسید اور علی گڑھ تحریک پر مقرر خصوصی کی حیثیت سے تقریر کرتے یہ چیز بڑی مفید اور مستند ہوتی ہے۔

آپ نے جون میں علی گڑھ چھوڑا۔ اس کے بعد ہی میں نے آپ کو خط بھیجا تھا۔ اُسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ آپ باہر گئے ہوئے ہیں اور کچھ دنوں بعد واپس تشریف لائیں گے۔ اس میں چند باتیں دریافت کی تھیں۔

(۱) آپ کے اسسٹنٹ کا کیا رہا؟

(۲) فکر و نظر کے تحقیقی یا تنقیدی رکھے جانے کا مسئلہ؟

(۳) فکر و نظر کے اس آخری سہ ماہی شمارے کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ صفحات کی گنجائش کم ہے اور امیدیں بھی زیادہ نہیں اس لیے مجھے اپنے خطبے کا حجم کم کر دینا ہوگا۔ چنانچہ اسے نصف کر دیا گیا۔ یعنی اب زیادہ سے زیادہ بیس صفحات پر آجائے گا۔ جب منگائیے گا بھیجدوں گا۔ زبان دہلوی "فکر و نظر" میں شائع ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۶

۲۰ر اکتوبر ۲ ۶ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

والا نامہ ملا۔ حالی اور اقبال سے متلق مضمون بالکل تیار ہے اس کو فوراً آپ کی خدمت میں بھیج سکتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ ایک بار اطمینان سے آپ اس کو بھی دیکھ لیں تاکہ کوئی ایسی بات شائع نہ ہو جائے جو کسی اعتبار سے نامناسب یا بے موقع ہو۔ آپ دیکھ لیں گے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ آپ نے لکھا ہے کہ شملہ جانے کے لیے پابہ رکاب ہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ مضمون آپ کی خاص توجہ سے محروم ہو جائے گا اس لیے اسے نہیں بھیجتا۔ لیکن اگر آپ یہ کر سکیں کہ امانت میں رکھ لیں اور سفر سے واپسی کے بعد دیکھ لیں گے تو بھیج دوں گا۔ خدا کرے آپ کی شملہ کی مہم پوری طرح کامیاب ہو جیسی کہ ایسی ہوتی رہی

انجمن کے الکشن کا نتیجہ دعوت میں شائع ہوا تھا اور نظر سے گزر چکا ہے۔ میں سب سے زیادہ یوسف صاحب کے میں تھا اور وہ ہو گئے۔ خوش ہوا۔ خدا مبارک کرے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

آپ کس تاریخ کو علی گڑھ چھوڑ رہے ہیں۔

۱۴۷

۷ر نومبر ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم ۔ آداب

کیسا مزاج ہے اور کس عالم میں ہیں؟ آپ تو باہر کسی سیمینار میں شرکت کے لیے گئے تھے اور آپ کے ساتھ شاگردوں کی ٹیم بھی تھی۔ دعوت میں پڑھا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی اس لیے مقالہ پڑھ نہ سکے۔ اس دوران ڈاکٹر اطہر صدیقی صاحب نے ایک خاتون کا مقالہ فکر و نظر میں شائع ہونے کے لیے بھیجا۔ اسے آپ نوٹ کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے کیا فیصلہ کیا۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی خیریت کی خبر ملے جس سے تردد دور ہو۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۸

۱۹/۱۱/۷۲

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

آپ کے پاس حالی، اکبرؔ اور اقبالؔ سے متعلق خطبے کے کچھ اوراق ہوں گے۔ اکبر کے بیان میں ایک پیراگراف کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ متذکرہ صدر شعرار میں سے آپ فکر و نظر میں کب کس کو جگہ دے سکیں گے یا نہ دے سکیں گے۔ اس لیے کہ اس کا بھی احساس ہے کہ اوروں سے کہیں زیادہ فکر و نظر کے اوراق میں مجھے حصہ ملتا رہتا ہے۔ نیز تحقیقی اور تخلیقی انداز کے مضامین کے تناسب کا مسئلہ بھی سامنے آگیا ہے وغیرہ۔ بہرحال اکبر سے متعلق اوراق مل جائیں تو اس میں ایک پیراگراف کا اضافہ کردوں۔ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ آسانی سے کہیں مل جائیں تو بھیج دیجیے گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۹

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

(۱) آپ دوبارہ حیدرآباد گئے اور واپس آ گئے یا نہیں؟

(۲) جامعہ اردو کے حالیہ جلسوں کی تفصیل ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے معلوم ہوئی تھی اب کیا ہوگا؟ شاید ۲۴ر کو پھر جلسہ ہے آپ اس میں شرکت فرما سکیں گے؟

(۳) لسانیات کے افق پر جو نیا ستارہ طلوع ہوا ہے اس کی مہورت ایک high priest نے کرا تو دی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عشاق کیا فیض پاتے ہیں[1]

(۴) فکر و نظر کے سال تمام نمبر میں اگر میرا مضمون حالی اور اقبال سے متعلق شائع ہوا ہو تو بلگرامی صاحب سے فرما دیجیے گا میرے لیے reprints کا انتظام رکھیں گے۔

(۵) ایک موقر رسالہ میں حوالی موالی لکھا دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے اہالی موالی ہونا چاہیے۔ کوئی مستند اردو لغت ہو تو دیکھ کر مطلع فرمایے گا۔

امید ہے آپ خوش و خرم ہوں گے۔ متعلقین بھی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] میرا اسلوب: نوآم چاسکی، ۸ر دسمبر ۷۲ء (ہماری زبان)

۱۵۰

۴؍جنوری ۷۲ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

اتوار ۷؍جنوری کو جامعہ اردو کی عاملہ میٹنگ ہو۔ بہتر ہو اگر آپ بعض امور بحث طلب پر ڈاکٹر نذیر صاحب اور سرور صاحب سے گفتگو فرمالیں۔ اچھا ہوگا اگر مسائل متنازعہ پر متفقہ فیصلہ ہو۔ جامعہ اردو کے مستقبل اور بہترین اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی طریق کار ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ اگر کشمیر کے چیف منسٹر میر قاسم صاحب کو امیر جامعہ منتخب کیا جائے تو بہت مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب اس بارے میں کوشش کردیں گے کہ اس منصب کو قبول فرمالیں میٹنگ سے پہلے آپ سرور صاحب اور نذیر صاحب سے مشورہ کرلیں تو بڑا اچھا ہوگا۔

میرا پہلا عریضہ بھی ملا ہوگا امید ہے آپ میری فرمائش قبول فرمائیں گے۔

۱۵۱

۸؍ جنوری ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم و محترم۔ آداب

کل شام کی گفتگو کے سلسلے میں عرض ہے۔ بعض معذوریوں کے سبب جن سے آپ واقف ہیں جامعہ اُردو کے کسی منصب سے منسلک نہیں رہنا چاہتا ہوں وہ منصب کتنا ہی اعزازی یا نمائشی کیوں نہ ہو۔ اس میں سب سے بڑی اور حال کی نزاکت جس کا مجھے غیر معمولی احساس ہے وہ یہ کہ جامعہ اُردو کے انصرام و انتظام میں ڈاکٹر رضوی صاحب کے ساتھ ایک مدّت تک کام کر چکا ہوں۔ موصوف نے ہر موقع پر میرا بڑا لحاظ رکھا ہے اور تعاون کیا ہے۔ وائس چانسلرشپ کے لیے میں نے ان کا نام تجویز کیا جو کسی نہ کسی سبب سے قابلِ قبول نہیں ہوا۔ اس بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں۔ آپ سب جامعہ اُردو کی نیک نامی کے خواہاں ہیں۔ ایک سے ایک زیادہ۔ اس کا میں احترام کرتا ہوں صرف اپنے بارے میں عرض کروں گا کہ میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں جامعہ سے وابستہ رہوں اور ڈاکٹر رضوی صاحب کلیتہً علاحدہ کر دیئے جائیں۔ میں نے آپ صاحبان کے اصرار کو برابر پیشِ نظر رکھا۔ آپ کی اور دوسرے دوستوں کی رفاقت مجھے عزیز ہے۔ ایسے میں مجبور ہو جاتا ہوں تو اپنی معذوری کا اظہار کرتا ہوں۔ لیکن یہ بھی گوارا نہیں کہ مجھے خوش کرنے کے لیے آپ کوئی ایسا راستہ

اختیار کریں جسے آپ پسند نہ کرتے ہوں۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آپ مولوی حاجی عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی کو پرو چانسلر منتخب فرمائیں۔ موصوف کی خدمت، شخصیت، تجربہ، شہرت اور ان کا مقامی ہونا سب اس کے متقاضی ہیں۔ ہم میں سے وہ سب کے لیے خاص طور پر مالک رام صاحب کے لیے قابلِ قبول ہوں گے۔ اس خط کی نقل میں سرور صاحب اور ڈاکٹر نذیر صاحب کی خدمت میں بھیجنے کی سکت نہیں رکھتا اس لیے کہ صبح سے آنکھوں میں درد شروع ہو گیا ہے چاہتا ہوں کہ فیکلٹی میں دونوں اصحاب مل جائیں گے۔ آپ ان سے اس عریضہ پر بحث کر کے مجھے مطلع فرما دیں۔ اس کے بعد مالک رام صاحب کو مطلع کر دوں گا۔ لیکن اس میں بھی کوئی قباحت نہیں دیکھتا ہوں کہ ان کو (مالک رام صاحب کو) اپنی معذوری لکھ بھیجوں۔ آپ صاحبان کے فیصلے سے آگاہی ہو جائے تو رفیق زکریا صاحب کو خط لکھوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ پروفیسر سرور صاحب اور ڈاکٹر نذیر صاحب کو مطلع کر رہا ہوں کہ میں نے آپ کو خط لکھا تاکہ آپ سب اس پر گفتگو فرمالیں۔ خط کی نقل نہیں بھیجی ہے۔ مجھے قوی امید ہے بلکہ آپ صاحبان سے درخواست ہے کہ میری مشکل آسان فرمائیں۔ شکریہ

۱۵۲

۲۸ر جنوری ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل شام ڈاکٹر نذیر صاحب تشریف لائے ان سے حالات معلوم ہوئے میری درخواست ہے کہ آپ جامعہ اُردو کی وائس چانسلری قبول فرمالیں اس کے بعد جیسی کچھ پیش آئے گی یا صورتِ حال ہو گی دیکھا جائے گا اور وہی کیا جائے گا جو آپ چاہیں گے۔

ایک بات کی طرف خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ موجودہ صورت یہ ہے کہ دو مقتدر ہندو عہدہ داروں (پنڈت راج ناتھ کنزرو مرحوم چانسلر اور پنڈت آنند نرائن ملا پرو چانسلر) کے بجائے دو مسلم عہدہ دار لانا چاہتے ہیں۔ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ طریقہ مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف ہے۔ جامعہ اُردو نیز مسلمانوں کے خلاف ایک سستا لیکن موثر حربہ فتنہ پردازوں کے ہاتھ آئے گا۔ اس لیے پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کو جوں کا توں پرو چانسلر رہنے دینا چاہیے۔ اس بارے میں سرور صاحب کو بھی لکھا ہے۔ اطلاعاً آپ کی خدمت میں بھی عرض ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۵۳

۱۳ / جنوری ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
عنایت نامہ ملا تھا آپ کی صحت کی بحالی کی خبر سن کر تردد رفع ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔ میرا خیال ہے یہ مسلسل اور طویل سفر کا strain تھا۔ بلڈ پریشر کو کم کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے اور موثر ثابت ہوئی ہے وہ یہ کہ دو تین دن کوئی پیشاب آور دوا استعمال کر لی جائے۔ ایسی انگریزی دوائیں عام ہیں اور کوئی بھی ڈاکٹر بتا دے گا۔ اب غالباً اس کی ضرورت نہیں رہی ہو گی لیکن اس کو ذہن میں رکھیے۔

آپ نے جامعہ کی سربراہی کا منصب قبول فرما کر مجھ پر احسان کیا ہے اس کا مجھے بڑا خوش گوار احساس ہے۔ میں جانتا ہوں اس طرح کے کاموں کے لیے آپ کے پاس نہ وقت ہے نہ کوئی دل چسپی۔ اس سے کہیں زیادہ ذمہ داری، منفعت اور اقتدار کے مناصب آپ نے یونیورسٹی میں نہیں قبول کیے۔

ٹرسٹیز کے انتخاب سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ منتظمین میں کچھ افراد ایسے ہیں جو اس ادارے کے بنیادی اور بہترین مقاصد کو ثانوی اور شخصی اغراض پر ترجیح نہیں دینا چاہتے۔ موجودہ رجسٹرار کے

طریقہ کار سے ایسے عناصر کو شہ ملے تو عجب نہیں۔ دعا ہے کہ آپ ان قباحتوں کو دور کر سکیں۔ ڈاکٹر رضوی صاحب کی رپورٹ پر جو کاروائی جس طور سے ہو رہی ہے اس کی بھی سمت و رفتار اندیشے سے خالی نہیں۔ اس لیے جامعہ کی صحت مندی اور اچھی شہرت کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

دعا ہے کہ آپ ان تمام دشواریوں پر قابو پائیں اور جامعہ کی کشتی موافق آب و ہوا میں ساحل مراد کی طرف بڑھتی رہے۔

میں نے فکر و نظر میں خطبات کے بعض حصوں کو شائع کرنے کے سلسلے میں جو باتیں عرض کی تھیں ان کی طرف سے آپ بالکل فکرمند نہ ہوں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں کسی طرح نہ چاہوں گا کہ رسالے کے عام مفاد اور مصالح کے راستے میں میری فرمائش کسی طور پر بھی حائل ہو وہی کیجیے صرف اتنا کیجیے کہ آپ تردد میں نہ پڑیں۔ اس سے مجھے بڑا اطمینان ہوگا۔

پریشر کی شکایت کے سلسلے میں اس کی احتیاط تھوڑی بہت ضرور ملحوظ رکھنی چاہیے کہ طویل زینوں پر ہر روز چڑھنے اور اترنے کا مشغلہ نہ ہو۔ آپ کا شعبہ غالباً تیسری منزل پر ہے اور یہ یقینی ہے کہ ہر روز دو ایک بار ضرور چڑھنا اترنا ہوتا ہوگا۔ یہ مشقت زیادہ ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نکالیے۔ خدا حافظ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۵۴

اتوار، ۱۱ر فروری ۷۳ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

دونوں نوازش نامے ملے۔ ایک کل دوسرا آج۔

ہماری زبان سے متعلق میری تحریروں کو کام میں لانا یا نہ لانا کلیتہً آپ کی صوابدید پر منحصر ہے جس طرح چاہیے کام میں لائیے البتہ یہ عرض کروں گا کہ چوں کہ یہ تقریباً تمام کسی نہ کسی شکل میں آپ کے context میں لکھی گئی ہیں یا یوں کہیے کہ آپ کے محور پر گردش کرتی ہیں اس لیے آپ کا حوالہ صراحتہً یا کنایتہً ضروری ہے۔ اس پر آپ کے ریسرچ اسکالر اصرار کریں تو عجب نہیں جب کہ میں بھی ان کی تائید کرتا ہوں۔

پہلے خط میں آپ نے اپنے چک اپ کی جو تصویر بھیجی تھی بحیثیت مجموعی ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہوں گے۔ پریشر کا ایک طرف سے ۱۷۰ ہونا جب کہ دوسری طرف سے ۹۰ ہو ڈاکٹروں کے نزدیک قابلِ لحاظ نہ ہوگا۔ لیکن چاہتا ہوں کہ ۱۷۰ کے بجائے زیادہ سے

زیادہ ۱۵۰ اور ۱۴۰ کے درمیان رہے تو اچھا ہوگا dieting
ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا ضرور لحاظ رکھیے کہ تن و توش کی کمی کے ساتھ
توانائی میں کمی نہ آنے پائے۔ خاص طور پر جب کمیں گاہ میں شکر
کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ فیکلٹی میں زینوں پر اترنے چڑھنے کا
مسئلہ بڑے تردد کا ہے۔ جو قوت آپ کئی دن میں آرام، غذا
اور پرہیز سے جمع کر پائیں گے وہ طویل زینے پر ایک بار چڑھنے
اترنے سے زائل کر دیں گے۔ یہ جمع خرچ کسی طرح قابلِ اطمینان
نہیں ہے۔ کمزوری کا اتنے دنوں کا اس طرح persist کرنا کر
زیادہ گفتگو سے بھی تکان محسوس ہونے لگے ٹھیک نہیں۔ معالج سے
اس کا ذکر کیجیے اور سیب سنترے سے رجوع کیجیے۔ انشاء اللہ
سارا کشٹ دور ہو جائے گا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۵۵

۲۵/۲ (سـ؟)

مسعود صاحب محترم ۔ آداب

مسودہ (   ) کو میں نے صاف کرلیا ہے۔ اب یہ آسانی سے پڑھا جا سکے گا۔ چاہتا ہوں کہ تکلیف فرماکر آپ اس پر ایک نظر ڈال لیں۔ ممکن ہے کہ کچھ ایسی باتیں راہ پا گئی ہوں جو غلط یا غیر ضروری ہوں یا تاریخی اعتبار سے مقدم موخر ہو گئی ہوں اس لیے محلِ نظر ہوں۔ اس کی تیاری میں میں نے اتنی کانٹ چھانٹ کی ہے کہ اب اس پر نظر ڈالنے کو نہ دل چاہتا ہے نہ ہمت ہوتی ہے آپ دیکھ لیں گے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ شکریہ

جب فرمائیے گا مسودہ بھیج دوں گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۵۶

۱۵؍مارچ ۷۳ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
۳۱؍کو آپ کی مجلسِ منتظمہ[1] کی میٹنگ ہے۔ اس میں رفیق زکریا صاحب شرکت کے لیے بمبئی سے آ رہے ہیں۔ پروگرام یہ ہے کہ ۳۱؍کو میل سے دہلی آئیں گے اور یکم کو میل سے (شام کو) دہلی واپس ہوں گے۔ ویسے تو حکومت کی سطح پر ان کے قیام کا بندوبست علی گڑھ کے سرکٹ ہاؤس میں ہوگا۔ لیکن خود زکریا صاحب اس کو ترجیح دیں گے کہ ان کا قیام یونیورسٹی گسٹ ہاؤس میں ہو۔ یہ آسان ہے اور بہتر بھی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ۳۱؍کو منتظمہ کی میٹنگ ہوگی اس میں اراکین کے لنچ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے اب کے یہ لنچ ذرا بہتر پیمانے پر کر دیا جائے جو ایک طور پر معزز مہمان کے شایانِ شان ہو۔ اس پر کچھ زیادہ بھی صرف ہو جائے تو خیال ہے کہ اس کی تلافی خاطر خواہ ہو جائے گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ زکریا صاحب کو ایک ایڈریس بھی اس تقریب میں دے دیا جائے جس میں ہم کچھ عرض مطلب بھی کر سکیں۔ یہ تقریب زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں ہو جائے گی

[1] جامعہ اُردو

گی اور اس کا وقت گیارہ بجے سے دو بجے تک نکالا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ سے گفتگو ہو جائے۔ یعنی یہ کہ محترم مہمان کا پروگرام کیا ہو گا۔ وائس چانسلر صاحب سے کیا گفتگو ہو کہ ایک طور پر یونیورسٹی کی طرف سے پذیرائی ہو جائے۔ informal or formal کسی طور پر زکریا صاحب نے جب جامعہ سے دائمی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے بھی جو کچھ ہو سکے اس سے دریغ نہ کریں۔ اس لیے آپ کی گفتگو وائس چانسلر صاحب سے ہونا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ صفائی وغیرہ کا انتظام علی گڑھ میونسپلٹی (جامعہ کے اردگرد) خود کرا دے گی۔ اس کا انصرام نثار صاحب کرا سکیں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

محترمہ بیگم زکریا بھی ساتھ ہوں گی۔

۱۵۷

۲۰ مارچ ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل دہلی کے روزنامہ دعوت میں یہ خبر پڑھی کہ اردو بورڈ[1] کی طرف سے آپ کو ۱۷۰۰/ انعام ملا۔ بہت خوش ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔ ساتھ ہی یہ محسوس ہوا کہ ۲۰۰۰/= کا کیوں نہیں۔ جہاں آپ کے علمی اور ادبی مرتبے کی بحث آئے گی اس طرح کا سوءِ ظن پیدا ہونا تعجب کی بات نہیں۔

آج سلمیٰ کے آنے کی توقع ہے آجائے تو مسعود محل charges کا معاملہ زوبراہ کر لیا جائے۔ بیٹھے بٹھائے کیسی زیر باری جامعہ کو اٹھانی پڑ رہی ہے، سوءِ اتفاق کو کیا کہیے۔

بلگرامی صاحب کو ہدایت کر دیجیے گا کہ مجھے اپنے مضمون کے حسبِ دستور ۲۵ آف پرنٹس درکار ہوں گے جن میں سرورق نہ لگایا جائے احتیاطاً میں نے ان کو ایک خط لکھ دیا ہے۔ والسلام۔ خیر طلب

رشید احمد صدیقی

کچھ دن ہوئے معلوم ہوا تھا کہ یوسف صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ پتہ نہیں معلوم تھا اس لیے سیدہ کو لکھا لیکن انھوں نے خط کا جواب نہیں دیا۔ کچھ آپ کو معلوم ہے؟

---

[1] اردو اکیڈیمی (اترپردیش) (رشید صاحب نے نام غلط لکھا ہے)۔

۱۵۸

جمعہ ٦ر اپریل ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
نوازش نامہ ملا۔ شکریہ۔ آپ تو جیسے اقبال کے کلام کا جامع اشاریہ ہوں۔
یونیورسٹی پر جو کچھ گزری اور گزرنے والی ہے اس کے بارے میں کیا کہوں۔ سالہا سال سے دور اور نزدیک کے مسلمان جس خواری میں مبتلا ہیں اس کو سن یا دیکھ کر ہمیشہ اور ہر وقت زاری کی ہے اور دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس مرحلے میں خیریت سے گزار دے ورنہ وہ نہ ہو جس کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہوا وہی جس کے نہ ہونے کی بارگاہِ باری تعالیٰ میں دعائیں مانگا کرتا تھا۔
کیا کہوں اور کیسے کہوں کہ علی گڑھ میں جو ہوا یا خدانخواستہ اور ہونے کو ہے اس میں ہمارا قصور نہیں ہے۔ جن طلبا کی ہوا خواہی اور عیب پوشی میں زندگی اور زندگی کی دی ہوئی نعمتوں کو وقف رکھا، خوش ہوا اور فخر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اچھے کام کرنے کی توفیق دی۔ ان کے طرزِ عمل کو دیکھ کر جیسا رنج پہنچا اور خواری ہوئی اس کو کیسے ظاہر کروں۔ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ ناگفتنی ہر اس جگہ ملتی ہے

جہاں مسلمان کسی نہ کسی حیثیت سے آباد ہیں۔ اس وائرس کو پہچاننے کے لیے مسلم وائرس کا طبّی نہیں اخلاقی نام دیا جا سکتا ہے۔

کیسی کیسی امیدیں ان بدنصیب اور گمراہ لوگوں سے ان کے مفلوک الحال اور قابلِ رحم والدین اور سرپرستوں نے لگا رکھی ہوں گی کہ امتحانات سے فارغ ہوکر روزی روزگار سے لگ جائیں گے۔ لڑکیوں کا سامان ہو جائے گا وغیرہ۔ اور کیا نتیجہ سامنے آ رہا ہے۔

ادھر ۲½ ماہ سے دیکھتا ہوں آپ کی صحت اعتدال پر نہیں آ رہی ہے اس لیے کوئی خاص اقدام کرنا پڑے گا وہ کیا ہو، وہ بھی آپ ہی کو طے کرنا پڑے گا۔ احتیاط، غذا، تفریح وغیرہ۔ دواؤں سے صرف اور اس وقت اور اسی وقت تک کام لینا چاہیے۔ جب تک ناگزیر ہو۔

اللہ تعالیٰ صحت اور خرمی بخشے۔ آمین

خیر طلب

رشید احمد صدیقی

۱۵۹

جمعرات ۲ر مئی ۷۳ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ سلام شوق

آپ کا عطیہ "اردو کا المیہ" کے دو نسخے پرسوں موصول ہوئے۔ یہ کام بہت اچھا ہوا۔ جی خوش ہو گیا۔ آپ کے قیمتی مضامین کتابی شکل میں آکر محفوظ ہی نہیں ہو گئے بلکہ ان کی فیض رسانی عام اور مسلّم ہو گئی۔ مستند علماء کے افکار عالیہ طالب علموں کے لیے بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ آج کل کا طالب علم عطائیوں کے سستے اور خطرناک بیوپار سے محفوظ رہتا ہے۔ اس مجموعہ مضامین کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اردو کے طالب علم کو اردو کے مسائل پر معمولی قسم کی کتابوں کے مطالعہ کی محتاجی نہیں رہے گی۔ یقین ہے اس گراں قدر مجموعہ کی پذیرائی غیر معمولی ہوگی۔

دوسری بات یہ کہنے کی تھی کہ آپ نے جو خدمت میرے سپرد کی تھی اس کو پورا کرنے کے لیے ایک ہفتہ سے سر مار تا رہا ہوں لیکن ایک بیش نہ گئی آتنا ہی اب شرمندہ اور مایوس ہوں کہ کچھ کر نہ پایا مجھے معاف کر دیجیے تو اطمینان ہوگا اور بہت خوش ہوں گا۔

امید ہے آپ خوش ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۶۰

۱۲ر مئی ۷۲ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب
میرا کل خط ملا ہوگا۔ ایک تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ کل ۱۵ر
کی میٹنگ میں غالباً یہ طے ہوگا کہ کون خطبہ دے۔ کمیٹی سے authorization
کیوں نہ لے لیجیے کہ آپ کسی موزوں شخص کا انتخاب کریں گے۔ ممکن ہے چند دنوں
بعد اپنی معذوریوں پر غلبہ پا سکوں۔ مشکل یہ ہے کہ آپ کی فرمائش پوری نہ
کرنے میں بڑی بے غیرتی محسوس ہوتی ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح
تعمیل کر سکوں۔ لیکن ایسا نہ کر سکا تو آپ کسی اور کو منتخب کر لیں گے۔ اب
کے کوئی خاتون کیوں نہیں۔ مثلاً بیگم حامدہ حبیب اللہ لکھنؤ یا بیگم
انیس قدوائی دہلی وغیرہ۔ خود گجرال صاحب سے کیوں نہ درخواست کی
جائے۔ مصلحت بھی اس کی متقاضی ہے۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ شاید
اردو بورڈ کی کوئی عہدہ دار یا ممبر ہیں۔
معلوم نہیں گجرال صاحب اردو میں نوشت و خواند کر سکتے ہیں یا نہیں؟
آج شام کچھ اور کرنے کو نہ ہو تو کچھ دیر کے لیے تکلیف فرمائیے۔ مندرجہ
بالا مسائل پر گفتگو ہو جائے گی۔ مگر یہ ضروری بالکل نہیں ہے۔
امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۶۱

۸ مئی ۷۳ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

(۱) خطبہ دینے والوں کی فہرست کیا ہے؟

(۲) سرسید بکڈپو نے مصنفین کی رائلٹی نہیں دی۔ بکڈپو کا مالی سال تو مارچ تک ختم ہوگیا۔ اب مئی ہے۔

(۳) اردو کی کوئی مختصر تاریخ نہ مل جائے گی جو صرف ایک جلد میں ہو۔ شرط یہ ہے کہ اس میں وہ تمام باتیں بھی مل جائیں جو میں چاہتا ہوں۔

امید ہے آپ خوش و خرم ہوں گے۔

میں انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں نہیں شریک ہوا۔ کوئی لاٹھی چارج یا آنسو گیس؟

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۶۲

۲۵ مئی ۷۳ء

مسعود صاحب محترم تسلیم

پرسوں فکر و نظر ملا۔ شکریہ۔ آپ کے غیر معمولی کرم کا شکر گزار ہوں کہ اس میں "عزیزانِ علی گڑھ" کی اتنی طویل قسطیں شائع ہوا کیں۔ یہ سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔ ناظرین فکر و نظر نے جس صبر و تحمل سے کام لیا ہے اس کو میں اپنا اور ان کا دونوں کا کارنامہ سمجھتا ہوں جس میں آپ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ البتہ اس بار ٹائپ کی فاش غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً مفاسد کو مقاصد، قوی کو قومی وغیرہ۔ اس سے مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا۔ جہاں کا ماگنا چاہیے وہاں بڑی پابندی سے فُل اسٹاپ یا ڈیش لگا ہوا وغیرہ۔ با ایں ہمہ خوش ہوں کہ بہت کچھ ہو گیا۔

کل ہماری زبان میں آپ کا مضمون نظر سے گزرا۔ اس سے انکار نہیں کہ سب زبانیں تشکیلی اعتبار سے یکساں طور پر اہم ہیں۔ البتہ ماہرین لسانیات سے ہمدردی کروں گا جن کی نظر میں ادنیٰ اور اعلیٰ زبان کا مفہوم عام ہے اور عربی و عجمی کی اصطلاحیں بے معنی ہیں۔ جزو کے ماہرین کی یہی محرومی ہے۔ زبان کی ابتدا کسی طور پر ہوئی ہو فرق اس وقت سے پڑنے لگتا ہے جب وہ تہذیب اور ثقافت کے دائروں کے قریب ہونے لگتی ہے۔ اس کی اہمیت بدلنے لگتی ہے اور بالآخر بہت

کچھ ہو جاتی ہے۔ اُردو کے مقدمہ کی وکالت میں مایوسی اور بے دلی کا اظہار اس بنا پر درست نہیں کہ وہ ناسازگار حالات سے دوچار ہے۔ اس کی حمایت اس لیے ضروری ہے کہ فرائض میں داخل ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ملک و تہذیب اور صحت مند تقاضوں کی آوردہ ہے جو اپنی حیثیت اور خدمات کے اعتبار سے عزت اور منزلت کی سزاوار رہ چکی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مسلمان جس خواری میں مبتلا ہو گئے ہیں جس میں ان کا قصور کچھ کم نہیں ہے اس سے ہم اس درجہ پسپا اور مایوس ہو گئے ہیں کہ اپنے کو اپنے کارناموں کو ساقط الاعتبار سمجھنے لگے ہیں۔ اُردو کی حیثیت صرف اس سے متعین نہیں ہو گی کہ اس سے کام میں لانے والوں کی تعداد کسی خطہ میں قابلِ لحاظ ہے یا نہیں بلکہ اس سے متعین ہو گی کہ اس کو کام میں لانے والوں کی تعداد کتنی اور کس حیثیت کی ہے اور اس زبان کا حق اس ملک اس کے حکمرانوں اور اس کے باشندوں پر کیا اور کتنا ہے۔

آپ ہی بتائیں جن اضلاع اور مقامات پر مسلمانوں کی (تکلف برطرف) جو تعداد اور حیثیت ہے اور وہی ہے اور اردو جس طرح کام میں لائی جاتی ہے اور اس کی جو نفس الامری حیثیت ہے اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ حق بجانب ہے...!

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۶۴

۱۴ر جون ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

(۱) آپ کو جون کا رسالہ جامعہ دہلی ملا ہوگا۔ اس میں آپ کے کسی انگریزی مضمون کا اُردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اُردو کے لسانیاتی ادب کا جائزہ' کے عنوان سے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ابتدا میں سوا صفحے (۲۰۷ - ۲۰۸) کا جو نوٹ ہے وہ آپ کا لکھا ہے یا اس کا اضافہ مترجم نے کیا ہے؟

(۲) فکر و نظر کے حالیہ شمارے میں میرے مضمون کا reprints نہ ملا۔ دس بارہ دن ہوئے بلگرامی صاحب نے بتایا تھا کہ جلدی مہیا کر دیا جائے گا۔

(۳) اس ماہ سے غالباً بلگرامی صاحب سبکدوش ہو رہے ہیں۔ ان کی اسامی کسی کے حصے میں آئی۔

(۴) جس گرمی سے سابقہ ہے۔ میرا خیال ہے آخرت میں اس کا ہم کو آپ کو کوئی نہ کوئی اجر ضرور ملے گا۔ کچھ اور نہیں تو دوزخ کی آنچ میں تخفیف سے۔

مندرجہ بالا کے پیشِ نظر آپ کی خیریت اور عافیت کا خاص طور سے طالب۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۶۴

دوشنبہ ، ۱۱ر جون ۷۳ء
یونیورسٹی ، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ تسلیم
مسعود صاحب بکرم

۸ ۔ ۱۰ روز ہوئے ایک رقعہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ کوئی اہم بات جواب طلب نہیں تھی۔ پھر بھی خیال آتا ہے کہ کیا بات ہے جیسا علی گڑھ کا موسم اور جہان گزران کی رفتار ہے اس سے دل میں وسوسوں کا پیدا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ کیا بلگرامی صاحب بالکل علاحدہ ہو گئے۔ یعنی کام کرنا بند کر دیا۔ کم و بیش تین ہفتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ میرے مضمون کے reprints مل جائیں گے وہ اب تک نہ ملے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جگہ پر کوئی مستقل انتظام تا حال نہیں ہوا ہے۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

۱۶۵

منگل - ۱۲ر جون ۷۳ء

مسعود صاحب محترم ۔ تسلیم
کل آپ کا خط بھی ملا اور reprints بھی بہت بہت شکریہ۔
اپنے پچھلے سے پہلے خط میں دریافت کیا تھا کہ جامعہ ملیہ کے حالیہ رسالہ میں آپ کے جس مضمون کا ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں اردو سے متعلق ایک صفحہ کا تعارف ہے یہ آپ کا لکھا ہوا ہے یا کسی اور کا۔
بلگرامی صاحب سے تاکید فرما دیجیے کہ وہ ان reprints کا بل میرے پاس جلد سے جلد بھیج دیں اس کو ادا کر دوں گا بڑا اطمینان ہوگا۔ ذرا دیر کی معمولی سی بات ہے جس کو وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔
خدا کرے خربوزہ اور آم کا درمیانی فصل امن چین سے گزر جائے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۶۶

۱۴ر جون ۷۳ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
خط کل ملا۔ رسالہ جامعہ دہلی میں آپ کے مضمون کا پہلا ٹکڑا کچھ اس طرح ختم کیا گیا ہے اور اس کے تحت حوالہ بھی دیا گیا ہے کہ مجھے یہ وسوسہ ہوا کہ شاید بطور تعارف کسی اور نے اضافہ کر دیا ہو اب اطمینان ہوا۔ اردو کے ابتدائی اور ارتقائی دور کو بڑے سلیس، مختصر اور جامع انداز سے پیش کیا گیا ہے جس کو ماننے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو۔ ارادہ ہے کہ آپ کے حوالہ سے اُسے کام میں لاؤں reprints کے بارے میں آپ نے جو بشارت دی ہے اس سے گھلوے کا مزہ آگیا۔ معلوم نہیں پورب کی اصطلاح اور روایت سے آپ واقف ہیں "کمیشن" سے اس کا مفہوم ادا ہوتا ہے لیکن وہ مزہ کہاں؟
...[1] صاحب سے آپ کی جیسی گفتگو ہوئی اور جس موضوع پر

---

[1] نقطے رشید صاحب نے دیے ہیں۔

ہوئی اسے سن کر متعجب بالکل نہیں۔ بدحظ بہت ہوا۔ کیا کیجیے جب corruption, اس طرح پھیلا ہو۔ جیسے آج کل کی گرمی، گرد، امس اور لو۔ کس کس بھیس میں کیسے کیسے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ مواخذہ کا ڈر نہ ہو تو جو کچھ ہو جائے تھوڑا ہے۔ اُردو گھر کی تعمیر اور تیاری کی جو اہمیت۔۔۔ ۔۔۔[1] کے نزدیک ہے وہ کوئی راز نہیں ہے۔ اس میں لعنت کی تدوین کا کوئی مقام نہیں۔ اسلام میں حیا کا بڑا درجہ بتایا گیا ہے اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ بے حیائی کیسی لعنت قرار دی گئی ہوگی۔ فکر و نظر کے در و بست کو بھی اس فتنے سے علٰحدہ رکھ کر کیوں دیکھیے یونیورسٹی کیا پوری دنیا اس مصرعہ کے محور پر گردش کر رہی ہے۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

ہم اپنے آپ کو اس سے بچا رکھیں گے تو دنیا ہماری احسان مند ہوگی!! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے کاموں میں ایسا نشاطِ کار بخشے گا کہ آپ کو کسی کے التفات کی محتاجی نہ رہے گی۔ انشاء اللہ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

با ایں ہمہ ہر کام کے لیے اپنے کو تیار رکھیے اس شرط کے ساتھ کہ وہ کام اپنے terms پر کریں گے۔ دوسرے کے ٹرم پر نہیں۔ جب اس درجہ افراتفری پھیلی ہوئی ہو جیسی کہ دیکھنے میں آرہی ہے اس وقت اسی اصول پر عمل کرنا چاہیے۔

---

[1] نقطے رشید صاحب نے دیے ہیں۔

کبھی یاد آئے تو مطلع فرمایئے گا کہ مرزا خلیل احمد بیگ[1] آپ کے شاگرد وہی طالب علم ہیں جنھوں نے بجٹنا گر صاحب کی ہسٹری آف ......[2] کا اُردو ترجمہ کر ڈالا تھا لیکن نظامی صاحب نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور کتاب جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس سلسلے میں مرزا صاحب نے مجھے ایک خط بھی لکھا تھا اگر وہ اس طرح آپ کے ساتھ کام میں لگ گئے ہیں تو مجھے اس کی بڑی خوشی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ۔ استاد شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

[2] اے ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ

۱۶۷

شنبہ، ۷ر جولائی ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

خطبہ تیار ہے۔ آخر کا ایک صفحہ finale بڑھانا ہے۔ اس کی ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ کافی دن باقی ہیں۔ خیال یہ ہے کہ مسودہ کو کسی شخص سے جس کا خط اچھا ہو اور آسانی سے پڑھا جا سکے نقل کرا لیا جائے۔ اس سے کمپوزیٹر کو بڑی آسانی ہوگی اور پروف ریڈنگ کا مسئلہ بھی آسان ہو جائے گا۔ ٹائپ کراتے میں خواہ مخواہ کا خرچ زیادہ ہوگا۔ صاف خط میں نقل کرا لینا آسان بھی ہے اور سستا بھی۔ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا خط تقریباً ۲۵ - ۲۶ صفحات پر محیط ہے جو خطبہ کے ساءز کے ۲۰ - ۲۵ صفحات لے لے گا۔ اس طور پر اگر [illegible] روپے نقل نویس یا خوشنویس کو دیا جائے تو زیادہ نہ ہوگا اور ٹائپسٹ کم سے کم ایک روپیہ فی صفحہ لے گا۔ یہ میرا تخمینہ ہے ممکن ہے زیادہ ہو۔ لیکن مجھے مسودہ کے نقل کرانے پر اصرار بالکل نہیں ہے۔ ممکن

ہے جامعہ اُردو متحمل نہ ہو تو مزید بارکیوں ڈالا جائے۔ ممکن ہے
جامعہ کے کنوکیشن سے متعلق پروفیسر فاروقی (دہلی) کل آپ سے ملے
ہوں۔ مجھ سے ملنے آئے تھے اور رفیق زکریا صاحب کی اسکیم سے
متعلق گفتگو کی تھی۔ میں نے وہی رائے دی جو نظامی صاحب نے
دی تھی۔ آپنے بھی غالباً safety first کے اصول پر گفتگو کی ہوگی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

چاہتا ہوں کہ خطبہ کا مسودہ صاف ہونے کے لیے اس وقت
دیا جائے جب آپ اس پر ایک نظر ڈالیں۔

۱۶۸

۱۲ر جولائی ۷۳ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
خطبہ کا مسودہ حاضر ہے۔ آخر کا صفحہ کسی دن لکھ کر بھیج دوں گا انشاءاللہ۔ اس سلسلے میں کچھ معروضات یہ ہیں۔
آپ کو پورا اختیار حاصل ہے کہ جہاں چاہیں اور جس طرح چاہیں، حذف، اصلاح اور اضافہ سے کام لیں۔ یہ کچھ نیازمندی کے سلسلے میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اس طرف سے مطمئن ہو جانا چاہتا ہوں کہ یہ خطبہ جامعہ کے بہترین مقاصد کے مطابق ہے اور بحیثیت شیخ الجامعہ آپ اسے پسند کرتے ہیں۔ آپ نے اشارہ کیا تھا کہ اس میں ایک جگہ لب ولہجہ communal ہو گیا ہے وہ فقرہ یا جملہ مجھے نہیں ملا۔ آپ کو مل جائے تو بدل دیجیے گا۔ ص ۱۴ یا ۱۵ ۱۵ پر رسالہ جامعہ دہلی کا ایک طویل اقتباس ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مناسب حال ہے۔ لیکن آپ چاہیں تو اس کو بالکل نکال دیں یا کتر بیونت کر دیں مجھے مطلق عذر نہ ہوگا۔ خطبے کی ابتدا کن حضرات کو مخاطب کرنے سے ہوگی وہ آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ خانہ پری کر دیجیے۔ خطبہ میں جا بجا بزرگو،

عزیزو، ساتھیو، دوستو کی جگہ چھوٹ ہوئی ہے اُسے آپ بھر دیجیے گا۔ مجھ سے نہ ہو سکا۔ خطبہ کے صفحات ۲۳ نہیں ہیں ۲۵ ہیں۔ ایک جگہ آپ نے بتایا تھا کہ انگریزی کی بحث بے ربط ہو گئی ہے اسے درست کر دیا ہے، آپ اطمینان کر لیجیے گا۔

مختصر یہ کہ آپ اسے اطمینان سے ایک بار پڑھ جائیں اور جہاں کہیں کسی قسم کی خامی یا کمی پائیں اسے درست کر دیں مجھ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تقرر کمیٹی میٹنگ[1] دہلی میں جو کچھ پیش آیا کبھی ملاقات ہوئی تو آپ سے سنوں گا۔ معلوم ہوتا ہے خاصا دل چسپ مشغلہ رہا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے پروفیسر کی پہلی انتخاب کمیٹی کی جانب اشارہ

۱۶۹

۱۲ر جولائی ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

دریافت کرنے پر ہم نغمانِ رفتہ[1] کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے یہاں دستیاب ہوا۔ یہ پہلے پہل معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپا۔ جلد یا کسی صفحہ پر یہ تحریر نہیں ہے کہ یہ ایڈیشن کب شائع ہوا۔

میں نے جس تحریر کے ساتھ کتاب کا ایک نسخہ خلیل صاحب کو پیش کیا ہے۔ اس میں میرے دستخط کی تاریخ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۰ء ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ کتاب ۶۶ء کے بعد شائع ہوئی۔ اطلاعاً عرض ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] تصنیف پروفیسر رشید احمد صدیقی

۱۷۰

۲۹ر جولائی ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم
کئی دن ہوئے خورشید عالم خاں صاحب کا خط آیا تھا کہ یوسف صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور داخل ہسپتال ہیں۔ اس کے بعد کوئی خبر آپ کو ہے۔ اللہ حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔
ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب نے جامعہ کے کنوکیشن کی کوئی تاریخ مقرر کی ہے؟ آپ کی فرمائش کے مطابق میں نے بھی یاد دہانی کرادی ہے۔
خطبے میں شامل ہونے کے لیے آخری صفحہ لکھ کر میں نے بھیج دیا تھا ضرور ملا ہوگا۔ آپ نے اُسے پسند کیا۔
اس کے بعد اسی صفحہ میں ایک لفظ کی تبدیلی کی فرمائش کی تھی وہ پرچہ بھی ملا ہوگا۔ اگر خطبہ آپ کے یا جنیدی صاحب[1] کے پاس ہو تو اس

---

[1] عظیم الحق جنیدی مرحوم جو اس وقت اعزازی خازن جامعہ اردو تھے۔

میں تبدیلی کر دیجیے پھر اس کا اندیشہ نہ رہ جائے گا کہ یہ تبدیلی درج ہونے سے رہ گئی۔

آخری صفحات زیادہ سے زیادہ کب تک کمپوزٹرس کے ہاتھ میں آئیں گے چاہتا ہوں کہ صفحہ ڈیڑھ صفحہ کا اضافہ کردوں۔ گو اس پر اصرار مطلق نہیں ہے۔ اب تک لکھا بھی نہیں۔ معلوم ہو جائے تو پھر سوچوں۔

معلوم نہیں جامعہ ملیہ میں ہوا کا رخ کیا ہے۔ اس طرف دل لگا ہوا ہے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۱

علی گڑھ ۲۱ر جولائی ۱۹۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ کل مل گیا تھا۔ بہت بہت شکریہ۔ یہ معلوم کرکے اطمینان ہے کہ خطبے کے چھپنے میں اتنی دیر لگے گی کہ میں باسانی سے کوئی تحریر اضافہ کرنے کے لیے بھیج سکتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ آخری صفحہ ہو۔

ایک بات ذہن میں آئی ہے کہ خطبہ کا آخری صفحہ جو میں نے سب سے آخر میں بھیجا تھا اور دو جگہ سے جڑا ہوا ہے اُسے میرے پاس بھیجدیا جائے اس میں ایک جگہ اصلاح کرنی مقصود ہے اور ہو سکا تو ایک آدھ صفحہ کا اضافہ کردوں گا۔ آخر تک پہنچنے میں ابھی کمپوزٹرس کو کافی دن لگیں گے۔ اس لیے آسانی سے اصلاح یا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۲

۲راگست ۷۳ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

چاہتا ہوں کہ آپ خطبہ کا آخری صفحہ (جس میں تلے اوپر تین ٹکڑے چسپاں ہیں) میرے پاس ذرا دیر کے لیے بھیج دیتے۔ میں ایک لفظ بدل کر اُسے ہمدست واپس کردیتا۔

پریس یا جنیدی صاحب سے اس کو منگا کر اپنے ہاں رکھ لیتے میرا آدمی جاکر کسی وقت آپ سے مانگ لیتا۔

یوسف صاحب کے بارے میں خبر آئی تھی کہ بعضلہ روبصحت ہیں۔ ہسپتال میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے۔

کچھ جامعہ ملیہ کی بھی خبر ہے کہ حالات کا رُخ و رفتار کیا ہے۔

طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ عوارض کا ہجوم ہے جن میں سے ہر ایک کو وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی جتانے پر اصرار رہتا ہے۔

دعا ہے آپ مع الخیر ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۳

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

(۱) گجرال کمیٹی سے آپ کے وفد کی ملاقات ہوئی یا ریلوے کی گڑبڑ سے تقریب ملتوی کردی گئی؟

(۲) خطبے کی طباعت کس منزل میں ہے؟ یہ اس لیے نہیں پوچھتا کہ اس کے جلد طبع ہو جانے کی خواہش ہے بلکہ بے کاری میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کوئی ٹھکانے کی بات ذہن میں آئے تو اس کو شامل کر دینے کا کہاں تک امکان ہے وغیرہ۔

اگر خطبہ کا آخری صفحہ آپ کے پاس ہو اور آسانی سے مل سکے بھیج دیجیے گا۔ ممکن ہے کہیں کچھ اصلاح کرسکوں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ زحمت ہو تو جانے دیجیے۔

(۳) کل یوم آزادی بھی منایا جاچکا اور دیوانے منتظر 'ہو'۔ میٹھے رہیے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۴

6. 9. 73

مسعود صاحب مکرم ۔ آداب

ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کے پروگرام کا کچھ اور علم ہوا یا نہیں، اتنا تو معلوم ہے کہ شنبہ ۱۵ ستمبر کو وہ جامعہ کے کنونکیشن کی صدارت فرمائیں گے۔

یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ دہلی سے کب اور کس ٹرین سے تشریف لائیں گے یا سفر موٹر سے ہو گا۔ کہاں قیام فرمائیں گے۔ بیگم صاحبہ بھی ہمراہ ہوں گی یا نہیں۔ خوشونت سنگھ اور عابد صاحب[1] پہلے کی طرح ساتھ ہوں گے یا کیا؟ کہاں قیام ہو گا۔ قیام تک کی تقریبیں کہاں کہاں ہوں گی۔ واپسی کب اور کیسے ہو گی۔

میرے ہاں ایک وقت کھانے کی گنجائش رکھیے گا، جیسا پچھلی

---

[1] عابد علی خاں صاحب، ایڈیٹر "سیاست" حیدرآباد

بار ہوا تھا مثلاً ڈنر کا، ارباب یونیورسٹی موصوف کی تشریف آوری کا کوئی نوٹس لیں گے یا نہیں وغیرہ۔

مختصر یہ کہ مجھے اپنے یہاں کی تقریب کی فکر ہے۔ اس طرف سے یکسو ہونا چاہتا ہوں۔

خطبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا یا نہیں؟

احباب اور اعزّہ کو بھیجنے کے لیے مجھے اس کے 25-20 نسخے درکار ہوں گے۔

اتر پردیش کے بعض قابل لحاظ روزناموں کو اگر دو چار روز پہلے ایک ایک نسخہ بھیج دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۵

۷ر ستمبر ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

یہ معلوم کر کے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب ۱۶ (اتوار) کو تشریف لا رہے ہیں۔

یونیورسٹی گسٹ ہاؤس میں قیام بہر گونہ بہتر ہوگا۔

معلوم نہیں لنچ کہاں تناول فرمائیں گے۔ جامعہ کی طرف سے تو شاید ایٹ ہوم ہو۔ ڈنر میرے ہاں طے ہے۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے خطبے کا ایک نسخہ محض جزو بندی کے ساتھ (یعنی ہر قسم کے زیورِ طبع سے محروم و مبرّا) مجھے کل تک مل جائے۔ محض یادداشت کی شکل میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

خطبہ کتنا پڑھا جائے گا۔ کہاں کہاں سے پڑھا جائے گا۔ یہ سب آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ میں اس میں بالکل حصہ نہ لوں گا۔ اس لیے مجھ سے مشورہ فرمانے کی ہرگز زحمت نہ فرمایئے گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۶

۱۰ ستمبر ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل کے خطبے کا بہت بہت شکریہ۔ کام چل گیا۔ بہت عمدہ چھپا ہے۔ سرورق لکھنے کے بعد اور دیدہ زیب ہو جائے گا۔

اس امر کا اظہار کر چکا ہوں کہ یہ کلیۃً آپ کے صوابدید پر منحصر ہو گا کہ خطبے کے کون کونسے حصے پڑھے جائیں گے۔ اس پر کتنا وقت صرف کیا جائے گا۔ اس بارے میں آپ میری مرضی کو اپنی مرضی سمجھیں۔

آج رات تک دو ایک نسخے اسی شکل میں نہ مل جائیں گے جن میں کل آپ کا بھیجا ہوا نسخہ تھا۔ ٹائٹل پیج کی ایسی ضرورت نہ ہوگی۔

امید ہے مزاج مع الخیر ہو گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۷

جمعرات، ۴ر اکتوبر ۷۳ء

مسعود صاحب محرم۔ آداب

یہ خط[1] قاضی محمد یونس صاحب کا ہے جو کبھی اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے رکن تھے اور ایک خاص مسلک کے غالی پیرو۔ پھر سرکاری ملازمت میں ہو کر شملہ، دہلی، افغانستان ہوتے ہوئے پھر دہلی آ گئے۔ مسلک میں بھی کچھ لچک آ گئی ہے۔ موصوف کو لکھ دیا ہے کہ آپ ان دنوں علی گڑھ سے باہر ہیں۔ آنے پر خط مل جائے گا۔ خط کے بین السطور میں جو کچھ ملتا ہے اس میں بظاہر بدگمانی کا دخل نہیں معلوم ہوتا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] قاضی محمد یونس صاحب نے یہ خط رشید صاحب کو میری جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلری پر نامزدگی کی خبر سن کر لکھا تھا جس میں اُن کے توسط سے اپنی "خوشی" اور "تردد" دونوں کا اظہار کرتے ہوئے کچھ ناخواستہ مشورے دیئے تھے۔

۱۷۸

شنبہ ۲۲ر دسمبر ۷۳ء

ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

۱۷ر کا گرامی نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ اتنی دیر میں ملا۔ اسے اسٹرائک کا کرشمہ کہیے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ کیا معلوم ایسے بھی دن دیکھنے پڑیں کہ کاتب اور مکتوب الیہ کا رشتہ ہی ٹوٹ جائے! فریاد از تطاول مشکیں کمند تو!

اکیڈمی[1] کے انتخابات کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے یا کر دیا ہے وہ میرے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ آپ نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے ہم۔ ۵ ممبروں میں آپ کو تائید کہاں کہاں سے ملتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کوشاں ہیں اور آپ نے جن صاحب کو لکھنؤ لکھا ہے ان کا میلان شاید موصوف کی طرف ہے۔ علی گڑھ کے بزرگ کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے میں پس و پیش ہے۔ ماضی کا مسلسل تجربہ سامنے ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ملّا صاحب کا

---

[1] اُردو اکیڈمی، اترپردیش

رجحان فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ موصوف کا اثر (انجمن کے راستے سے)۔۔۔۔[1]۔۔ صاحب پر مسلّم ہے۔ آپ سے کبھی مُلّا صاحب کی ملاقات ہوتی ہے۔

یہ بڑا اچھا کیا کہ سرما کی تعطیلوں میں متعلقین کو دہلی بلالیا۔ میرا خیال ہے کہ بیوی بچّے پورے طور پر لطف اندوز ہوں گے۔ اس تعطیل اور تفریح کے وہ مستحق بھی ہیں۔ آپ نے زمان و مکان کا لطیفہ بڑا اچھا لکھا۔ زندگی آج کل جس فساد و فشار میں مبتلا ہے۔ اس میں اس طرح کے لطائف پیدا کرلینا بڑے صحت مند جسم و جان کی دلیل ہے۔ جامعہ اُردو کے بارے میں آپ جو کچھ طے کریں گے وہی بہتر ہوگا۔ میں تو بالکل خالی الذہن ہوں۔ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے ربط قائم رکھیے۔ کچھ اور نہیں تو خط و کتابت ہی ہے۔ معلوم نہیں اس بارۂ خاص میں کچھ پیش رفت ہوئی یا نہیں۔ جامعہ بکڈپو لمیٹڈ والوں (احمد ولی صاحب نے) مطلوبہ آٹھ جلدیں لکھنؤ بھیج دی ہوں گی۔

کام اور خدمت کرتے عمر گزر گئی۔ کتنی طویل عمر جو میری جیسی نامعتبر صحت والے کو شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔ پورے ۸۱ سال! اس دوران میں کبھی اس کی طرف خیال نہیں گیا کہ میری بھی کوئی خدمت کرتا ہے یا نہیں۔ اب جب کہ جسم کے سارے اعضا "زوال آمادہ" ہیں۔ معمولی آدمی کی طرح flesh کی کمزوری spirit کی توانائی

---

[1] نقطے رشید صاحب کے ہیں۔

پر تیزی سے غالب آنے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی قریب ہو۔ اس کی رفاقت سے وہ چیز بالیدہ ہو گی جس نے میری کلفت میں ہار نہیں مانی۔ کاش احسان پاس ہوتے۔ لیکن ! Poor Ehsan خدا ان کو خوش رکھے۔ آمین۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

مسعود صاحب میری استدعا ہے کہ اس خط کو تلف کرڈالیے گا۔

رشید احمد صدیقی

۱۷۹

شنبہ ۱۹ جنوری ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
سلمیٰ کا ابھی ایک خط ملا جس کی مفصلاً ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔
"آپ کی تصنیف ہمارے ذاکر صاحب کے بارے میں لکھنؤ والوں نے بتایا کہ اس اوارڈ کے لیے پبلشر کی طرف سے کتاب اور سفارش کا آنا ضابطے کی اہم کڑی ہے۔ لہٰذا پبلشر سے ضرور کہیے کہ وہ کتاب کو اپنی پرزور سفارش کے ساتھ وہاں ضرور بھیجدیں۔"
غالباً اس سے یہ مراد ہو گی کہ پبلشر کی طرف سے ایک تفصیلی نوٹ یا تعارف کا ہونا ضروری ہے۔ حالاں کہ یہ کام اکیڈمی کے ریویو کرنے والوں کا ہونا چاہیے۔ بہرحال آپ جیسا مناسب خیال فرمائیں۔ منیجر صاحب جامعہ بکڈپو لمیٹڈ کو ہدایت فرمادیں۔
وہ تحریک جو آپ نے اٹھائی تھی اس میں کچھ پیش رفت ہوئی؟
امید ہے آپ بفضلہٖ مع الخیر ہوں گے۔
میرے پچھلے عریضہ کو، امید ہے، آپ نے میری درخواست کی بنا پر تلف کر دیا ہوگا۔ یہ آپ کا مجھ پر کرم ہوگا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۸۰

شنبہ ۶؍اپریل ۷۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

آج دعوت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ آپ کو یوپی اکیڈمی سے "اُردو کا المیہ" پر دو ہزار کا انعام منظور کیا گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے اور آپ کو بہت بہت مبارکباد۔

خورشید عالم خاں صاحب[1] کو حکومت ہند سے جو اعزاز ملا ہے اس پر ان کو اور آپ دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کبھی جواب لکھیے تو یوسف صاحب کی صحت کے بارے میں ضرور لکھ دیا کیجیے۔ اس لیے کہ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں محمود صاحب احسان سے اکثر دریافت فرماتے رہتے ہیں۔

امید ہے آپ اپنے اور اپنے کام سے بیش از بیش خوش ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین کے بڑے داماد جو راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

۱۸۱

۲۰ر اپریل ۷۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب
گرامی نامہ مورخہ ۱۸ر کل صادر ہوا اور بہت خوش ہوا۔ اس لیے کہ خاص طور پر کہ انعام ملنے پر آپ کا جو "ردّ عمل ہجوم" کی طرف سے ہوا، بجنسہٖ میرا بھی تھا۔ تفصیل سے بعد میں لکھوں گا۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ۔۔۔[1]۔۔ صاحب کو فی الفور لکھ دیں کہ مجھے اس رقم سے معاف فرمایا جائے جو علاج معالجہ کے لیے مریض اور بیمار مصنفین کو دی جاسکتی ہے۔ بفضلہٖ میری حالت اتنی "زار و نزار" نہیں ہے۔ وغیرہ۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] رشید صاحب نے نام حذف کردیا ہے۔ لیکن اشارہ خورشید عالم خاں صاحب کی جانب ہے۔

۱۸۲

جمعہ، ۱۲ جولائی سنہ ۷۴ء

یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل معلوم ہوا کہ ۲۲ جولائی کو ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب جامعہ اُردو کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ۲۰ کو کانگرس کی کسی میٹنگ میں دہلی میں ہوں گے۔ معلوم نہیں یہاں کا موصوف کا پروگرام کیا ہے۔ غالباً وہی ہوگا جو برسوں سے یہاں کا رہا ہے۔ حفیظ الدین صاحب اُردو ڈکشنری کے کام سے شاید بمبئی منتقل ہو گئے۔ لکھا تھا کہ انھوں نے اُردو بورڈ کی ملازمت اختیار کر لی اور آخر جون تک بمبئی چلے جائیں گے۔ موصوف نے اطلاع دی تھی کہ میری کتابوں پر کمیشن کی جو سالانہ آمدنی ہوگی وہ مینیجر صاحب جامعہ بکڈپو لمیٹڈ سے دلوادیں گے۔ یہ کام سالہا سال سے انھیں کے سپرد تھا۔ کاغذ کی مہنگائی کا جیسا پریشر ہے اس کی وجہ سے لکھا تھا کہ جامعہ بکڈپو کی دشواریاں بہت بڑھ گئی ہیں لیکن مینیجر صاحب بمبئی سے آجائیں گے تو دیکھا جائے گا معلوم ہوتا ہے کہ مطلب براری نہ ہو سکی۔ آپ کچھ کر سکتے ہوں اور مناسب ہو تو کبھی کہہ دیجیے گا ورنہ کوئی بات نہیں۔

اینہم اندر مفلسی بالائے غم ہائے دگر

خیر طلب

رشید صدیقی

١٨٣

٢١ر جولائی ۴۷ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

عرصہ ہوا گرامی نامہ ملا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ جامعہ اُردو کی مجلس عاملہ میں شرکت فرمائیں گے لیکن عدیم الفرصت ہونے کے سبب سے شاید ملنا نہ ہو۔ آپ نے میری فرمائش پر یہ بھی لکھا تھا کہ کتابوں کی رائلٹی کے بارے میں جامعہ بکڈپو لمیٹڈ کو کھٹکھٹائیں گے لیکن صدائے نبر خاست۔ یہ کام حفیظ الدین صاحب کرادیا کرتے تھے۔ بمبئی جاکر انھوں نے مطلع کیا تھا: "...... کو بمبئی پہنچ گیا۔ نکلنے سے پہلے مکتبے کے کارکن متعلقہ سے معلوم کیا تھا۔ چک بن گیا تھا۔ دستخط باقی تھے۔ غالباً پہلی دوسری (جولائی) تک انھوں نے بھیج دیا ہوگا۔" آج جولائی کی آخری تاریخ ہے اب تک کوئی چک نہیں ملا۔ حفیظ الدین صاحب کا یہ خط بمبئی سے لکھا ہوا ٢١ر جولائی کا ہے۔

جامعہ اُردو کے عہدہ داروں کا بہت اچھا انتخاب ہوا

اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ آپ نے جامعہ کی مزید خدمت
کی ذمہ داری قبول فرمالی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے گفتگو
آئی تھی۔ موصوف نے بڑی خوشی سے اس کا اظہار فرمایا تھا کہ انھوں
نے آپ کو مزید تعاون پر آمادہ کر لیا ہے۔ طبیعت اچھی نہیں ہے۔
اس پر طرح طرح کے آلام کا ہجوم! دعا ہے کہ آپ خوش و خرم ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۸۴

شنبہ، ۷/ستمبر ۸۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی[1]

اور خبر میں "تواتر" بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ راس لائے۔ ذاکر صاحب اور یوسف صاحب کی خدمات کے علاوہ خود اپنی خدمات، تجربہ، شہرت، ادارے سے الفت و ارادت ان سب کے ہوتے ہوئے آپ کے مقابلہ میں کوئی صاحب فہم کسی اور کو نہیں پیش کر سکتا! کیا میں صحیح نہیں کہتا؟!

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۸۵

۲۸ر نومبر ۱۹۷۴ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔

آپ کے ۲۷ر اکتوبر کے نوازش نامہ کا جواب دینے کی آج نوبت آئی۔ ان دنوں اسی طرح اوقات رہ گئے ہیں۔ آپ سرسید ڈے پر تقریر کرنے تشریف لائے تھے۔ کمال نے شرکت کی تھی۔ آکر تفصیل سنائی۔ آپ مجھے پہلے سے مطلع فرما چکے تھے کہ وقت تنگ ہونے کے باعث ملاقات نہ ہو سکے گی اور یہی ہوا۔ میرے لیے اتنا بہت ہے کہ آپ خیریت سے ہیں اور اپنے مشاغل سے مطمئن اور خوش و خرم۔ میری دعا ہے اور یقین کہ حالات معمول پر رہے تو آپ علی گڑھ واپس آئیں گے۔ "آب رفتہ آید بجو" انشاءاللہ۔

فکر و نظر جب تک ذاتی اور شخصی ذمہ داری میں رہا۔ کامیاب رہا۔ اب منصبی اور دفتری routine میں چلا گیا۔ انجام معلوم۔ گرد و پیش اور دور و نزدیک کو جن احوال میں پاتا ہوں اس سے طبیعت پست رہتی ہے اس پر عمر اور طرح طرح کی تکالیف اور معذوریوں کا فشار۔ اور کسی ہمدم دیرینہ کے ملنے کا کیا سوال جب تقریباً تمام ہمدم دیرینہ مفارقت کر چکے۔

احباب کو پرسش و سلام۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۸۶

اتوار، ۲۹ر دسمبر ۷۴ء

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نہ عید کی تہنیت بھیج سکا نہ بڑے دن کی۔ ذرا کہیں ایسا نہ ہو کہ سالِ نو کی بھی نہ بھیج سکا تو کیا ہوگا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھتا ہوں اور سالِ نو کی تہنیت بھیجتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے محترم جاننے والوں کو سالِ نو مبارک فرمائے آمین۔ کئی سال ہوئے ذاکر صاحب مغفور کی صدارت میں جامعہ ملیہ کا کنوکیشن ایڈریس میں نے دیا تھا۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب جانتے ہیں۔ اس خطبے کی بڑی ضرورت ہے، (اردو اڈیشن کی اس کا انگریزی ترجمہ نہیں) ممکن ہے عبداللطیف اعظمی صاحب کی کوشش سے مل جائے۔

ہم سب بفضلہٖ مع الخیر ہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۸۷

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ[1]

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل دفعتہً الجمعیۃ سے محمود صاحب[2] کی رحلت کی خبر ملی۔ کیا کہوں کیا گزری اور ان سب پر کیا گزری ہو گی جو مجھ سے بدرجہا زیادہ مرحوم سے قریب ہیں۔ ذاکر صاحب کی وفات پر ان کا بے اختیار دہلی آنا، صدمہ کی تاب نہ لاکر قلب کی شدید تکلیف میں مبتلا ہو جانا، پھر کراچی کو واپسی۔ کس محرومی اور بے بسی کے عالم میں۔ سب جانتا ہوں ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ذاکر صاحب مرحوم اور بیگم صاحبہ کے کتنے شیدائی تھے اور بیگم صاحبہ تو خاص طور پر شفقت فرماتی رہی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد مرحوم کو نہیں دیکھا۔ لیکن اس وقت ۱۹۱۵ء اور ۱۷ء کا زمانہ یاد آرہا ہے جب وہ تقریباً طفلِ معصوم تھے اور ذاکر صاحب سے ملنے کچی بارک آیا کرتے تھے۔ یوسف صاحب ساتھ ہوتے۔

---

[1] محمود صاحب کا انتقال اپریل ۱۹۷۵ء میں ہوا تھا۔ یہ خط اس کے بعد کا ہے۔

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین کے برادر خرد اور مرتب کے چھوٹے چچا۔ سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی۔

بڑھاپے میں مرحوم عزیزوں کا بچپن کس حسرت سے یاد آتا ہے اور کیسا قلق ہوتا ہے، کیا بتاؤں۔ اور کیسی حیرت اور عبرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور بچے بیوی اور متعلقین کو صبر جمیل دے۔ آمین۔ مسلمانوں کے کسی مرحوم کے لیے اس سے بڑی دعا اب تک سننے میں نہیں آئی۔ اس وقت اسی کا سہارا پکڑتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ اللہ توفیق دے۔ آمین۔

دہلی جائیے گا؟

آپ کی محرومی اور قلق میں شریک

رشید احمد صدیقی

۱۸۸

بدھ، ۲۴ ستمبر ۷۵ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم تسلیم

۲۲ کا گرامی نامہ کل شام صادر ہوا۔ اس سے پہلے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ اہلیہ کی طبیعت بفضلہٖ روبصحت ہے۔ زندگی کے معمولات پورے کرنے لگی ہیں اور معالج مطمئن ہیں۔ اس دن کا اضطراب یاد ہے جب آپ سے سہ پہر میں ملاقات ہوئی تھی اور اس کا ردِ عمل بھی مجھ پر نہیں رہا جو آپ پر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ حالات روبراہ ہیں لیکن وقت اور حادثہ اپنے تقریباً مستقل حادثات چھوڑ گیا ہے۔ جن حالات میں ہوں اس میں عموماً یہی ہوا کرتا ہے۔ آپ کی طبیعت کے ناساز ہونے کا حال معلوم ہوا۔ کیوں اور کیسے؟ بہرحال اللہ کا کرم ہے کہ وہ تکالیف باقی نہیں رہیں۔

دعا کرتا ہوں کہ آپ اور متعلقین بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۸۹

اتوار ۲۹ ستمبر ۷۵ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
رمضان شریف اور مزاج شریف۔ ماہِ صیام میں پرسشِ احوال کی ترتیب اسی طرح کی رکھتے ہیں۔
ڈاکٹر صفی احمد جو اس خط کو آپ تک پہنچائیں گے اسی یونیورسٹی کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ ان کے اسناد سے جو ہم رشتہ ہیں، آپ ان کی گونا گوں علمی اور فنی اکتسابات اور صلاحیتوں کا اندازہ فرمائیں گے۔ اور بالمشافہ صحت، شرافت اور شخصیت کا۔ ممتاز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے ہاں کے شعبۂ تاریخ کی ریڈرشپ کے امیدوار ہیں۔ کیسی خوشی ہوگی ہم سب کو اگر یہ آپ کے سایۂ شفقت میں پہنچ جائیں گے اور فائز المرام ہوں گے۔
ان سے مجھے جو خاص طور پر انس ہے وہ اس بنا پر ہے کہ یہ ہمارے ایک بڑے مخلص اور عزیز دوست ڈاکٹر عارف صدیقی صاحب کے عزیز قریب ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے ڈاکٹر صاحب کا شمار ہمارے

میڈیکل کالج ہسپتال کے صفِ اوّل کے ماہرینِ امراضِ قلب میں
ہوتا ہے۔ میرا قلب جب کبھی صراطِ مستقیم سے ہٹتا ہوا محسوس ہوتا
ہے تو میں بیک وقت اللہ تعالیٰ اور ڈاکٹر عارف اور ڈاکٹر مہدی حسن[1]
صاحبان سے رجوع کرتا ہوں اور خدا کے فضل سے معاملہ روبراہ
ہوجاتا ہے۔ اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میرے ان
ڈاکٹروں سے میرا خدا کتنا راضی رہتا ہے۔

دعا کرتا ہوں کہ آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

[1] جواہر لال میڈیکل کالج (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے پروفیسر صاحبان اور رشید صاحب کے معالج۔

۱۹۰

۲۴؍جنوری ۷۶ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

گرامی نامہ جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ابھی ابھی موصول ہوا۔ کل مجھے عبداللطیف اعظمی صاحب کا تفصیلی نوازش نامہ ملا تھا۔ جو باتیں میں نے دریافت کی تھیں۔ اس کا نہایت مفصل جواب موصوف نے دیا تھا۔ جس سے صورت حال معلوم کر کے مطمئن ہو گیا۔ اعظمی صاحب کو علاحدہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ یہی عریضہ حوالہ کر دیجیے گا۔ ان کو رسید مل جائے گی۔ ان دنوں بڑے تشویش میں گزارنے پڑے۔ شاید اب اسی مصرف کا رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی۔

آپ کی مصروفیتوں کا حال سن کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ اچھا کام اچھے ہاتھوں انجام پا رہا۔

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم

دعا ہے کہ متعلقین مع الخیر ہوں، بالخصوص جاوید سلمہ اللہ تعالیٰ جو ہم سب سے دور ہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

حیدرآباد اردو لغت

جناب حسن الدین احمد
حیدرآباد

• **جناب حسن الدین احمد**۔ (پ: حیدرآباد ۱۹۲۲ء) ۱۹۴۲ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کی تکمیل کی۔ ۱۹۴۷ء میں اوقافی امور کی بابت ممالک یورپ اور ترکی میں تربیت حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں بین الاقوامی مذہبی کانگریس اور بین الاقوامی امن کانفرنس (ٹوکیو، جاپان) میں بحیثیت مندوب شرکت کی۔ ممبر انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس۔ (I.A.S)

چند اہم تصانیف۔ ہندوستان کا معاشرتی نظام ۱۹۴۶ء۔ اردو ترجمہ بھگوت گیتا ۱۹۴۷ء۔ نظری علاج ۱۹۵۴ء۔ اردو الفاظ شماری ۱۹۷۲ء (اس کتاب پر یوپی اردو اکیڈمی نے خصوصی ایوارڈ دیا) جامع العطیات ۱۹۷۴ء۔ انجمن ۱۹۷۴ء وغیرہ۔

ممالک غیر۔ جاپان، چیکوسلواکیہ، اسرائیل اور روس میں اردو کتب خانے قائم کیے۔

صدر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز۔ صدر ولا اکیڈمی۔ **جنرل سکریٹری** قومی کمیٹی سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو۔

انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس (I.A.S) سے ریٹائر ہوکر آجکل حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں اور علم و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔

••



اردو زبان ایک طویل دریا کے مانند ہے، جو ایک عظیم زبان کی حیثیت سے ہے تو ایک اکائی لیکن ہر علاقہ میں اس کا بہاؤ ایک علٰحدہ انداز اور انفرادیت رکھتا ہے۔ اردو زبان کی کوئی عظیم لغت مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں علاقائی رنگ و روپ کے ساتھ اردو لغت کے رنگا رنگ دھنک کو پیش کیے جانے کا منصوبہ نہ ہو۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ عظیم تر خدا بخش اردو لغت کے منصوبہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے الفاظ کو شامل کرنا طے پایا ہے۔

حیدرآباد اردو لغت کی تدوین کے سلسلے میں خود زبان اردو کے وسیع کینوس کا تعین ضروری ہے۔

ماضی میں اردو کے کاروان کو تلاش کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں بہت قدیم زمانہ سے عوام کی زبان اور اونچے طبقہ کے خواص اور مذہبی رہنماؤں کی زبان کی کشمکش جاری ہے۔

اب سے کم و بیش چار ہزار سال پہلے آریہ نسل کے لوگ ہندوستان آئے تو اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی زبان کو جو ایک معین معیاری زبان کی شکل میں نہیں بلکہ متعدد بولیوں کے ایک گروہ کی حیثیت سے متفرق آریہ قبیلوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی تھی یہاں کے رہنے والوں پر فاتحانہ شان سے مسلط کیا۔ ان میں سے صرف ایک ابتدائی بولی ویدوں کی زبان ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی۔ خود آریہ بھی یہاں کے رہنے والوں سے متاثر ہوئے اور دیسی بولیوں کے الفاظ و محاورات کو قبول کیا۔ کچھ عرصہ یہ آزادانہ میل جول قائم رہا۔ اس کے بعد برہمنوں نے اونچے ادبی معیار پر ویدوں کی زبان تدوین کی۔ اس طرح سنسکرت پیدا ہوئی جس کے معنی ہیں شستہ۔ یہ خواص کی زبان تھی قدیم ہند آریائی دور جو پندرہ سو سے پانچویں صدی قبل مسیح تک قائم رہا سنسکرت کے عروج کا دور ہے۔ عوام کا کام پراکرتوں سے چلتا رہا۔ جین مذہب اور اس کے بعد بدھ مذہب کے پیشواؤں نے برہمنیت کے خلاف زبردست آواز اٹھائی تو اپنی تعلیم عوام کی زبان میں دی۔ اشوک اعظم نے تبلیغ کا سارا کام پراکرت کی ادبی شاخ پالی میں کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے پہلے بدھ مذہب کے پیروؤں نے سنسکرت کو چھوڑا (۱) اور جو یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے

دسویں صدی عیسوی تک سے میں علاقہ واری زبانوں میں مذہبی لٹریچر کو رائج کیا! ۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۰۰۰ عیسوی تک پراکرت زبانوں نے رواج پایا۔ ۶۰۰ عیسوی کے لگ بھگ ہندوستان میں بیس سے زیادہ پراکرتیں بولی جاتی تھیں، جن میں پالی، جینا، مہاراشٹری، شوراسینی اور مگدھی زیادہ مشہور تھیں۔ اس دور کے قواعد نویسوں نے عوام کی بولیوں کو اپ بھرنش یا اپ بھرشٹ (بگڑی ہوئی زبان) کہہ کر پکارا۔ راجپوتوں کے دور میں اس زبان کی ادبی شاخ شورسین دیس (متھرا اور اس کے ارد گرد کے علاقے) کی اپ بھرنش "شورسینی اپ بھرنش" کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۰۰۰ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اپ بھرنش کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں جسے جدید ہند آریائی دور قرار دیا جاتا ہے جدید ہندوستانی زبانیں پنجابی، گجراتی، مراٹھی، راجستھانی، اُوڑیہ وغیرہ اُبھرنے لگی تھیں۔ ان میں سے ایک مغربی ہندی بھی تھی جو شورسینی پراکرت سے نکلی۔ یہ گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں صدیوں سے بولی جاتی رہی تھی۔ مغربی ہندی کی ایک شاخ کھڑی بولی تھی جس پر اردو کی بنیاد قائم ہے۔

جس طرح بدھ مذہب کی اشاعت کے ساتھ پالی جو بہار کی زبان یا بالائی دوآبہ کی زبان تھی ایک چھوٹے سے علاقہ سے نکل کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی تھی اس طرح مسلمانوں کی آمد کے بعد کھڑی بولی بھی تمام ملک میں پھیل گئی۔ کھڑی بولی زیادہ تر ہندوؤں کی زبان تھی جو دہلی سے بہار تک کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔

پھر ایک بار میں اردو زبان کے بہاؤ کو دریا کے بہاؤ سے مشابہت دونگا۔ یہ بہاؤ طویل عرصہ پر حاوی رہا۔ کبھی اس کو کچھ نام دیا گیا اور کبھی کچھ۔ اس دوران اس کے بہاؤ میں چشموں نالوں کا پانی شامل ہوتا رہا۔ کسی چشمہ کے پانی کے ملنے سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک نیا دریا وجود میں آ گیا۔ مسلمانوں نے نہ تو کسی نئی زبان کی داغ بیل ڈالی اور نہ ان کے ہندوستان آنے کے بعد ان کے اور مقامی باشندوں کے اختلاط سے کسی نئی زبان نے جنم لیا۔ جیسا کہ عام طور پر سطحی انداز میں خیال کیا جاتا ہے۔

آل سبکتگین کے زمانہ میں (۹۷۷ء تا ۱۱۸۶ء) ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور مسلمانوں نے ملکی زبان کو قبول کر لیا تھا اور ملکی زبان نے مسلمانوں کی زبانوں یعنی فارسی اور ترکی کے الفاظ کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے سو سال بعد انھوں نے جنوب کا رخ کیا۔ علاء الدین خلجی ایک صاعقہ کی طرح دیوگری پر نازل ہوا اس سے زیادہ تخریبی حملہ ملک کافور کا تھا۔ اس کے بعد ایک بڑا سیلاب محمد تغلق کے زمانہ میں اٹھا۔ جب ۱۳۲۷ء میں پایہ تخت کو دہلی سے کھڑکی منتقل کیا گیا۔

اردو کی پیشرو کو ہندوی کا نام اس وقت ملا جب وہ مسلمانوں کے ساتھ ملک کے دوسرے علاقوں تک

پہنچی اور برصغیر کے ہر علاقہ میں اس کو تہذیبی اور ادبی زبان کی حیثیت ملی۔ حضرت امیر خسروؒ اور شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۱۴۹۶ء) اردو کی پیشرو کو ہندوی کے نام سے پکارتے ہیں۔

تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں دہلی کا اثر جنوب میں کرناٹک تک مشرق میں بنگالہ تک اور مغرب میں گجرات تک پھیل گیا۔ اردو کی پیشرو ہندوی دکن اور گجرات میں علیحدہ علیحدہ خوب پروان چڑھی۔ دکن میں یہ دکھنی کہلاتی اور گجرات پہنچی تو وہاں کے مقامی خصوصیات کی وجہ سے گجری کہلانے لگی۔

یہاں دکن کی اصطلاح کی صراحت ضروری ہے۔ دکن کی اصطلاح سنسکرت لفظ دکھشن سے نکلی ہے، جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں۔ جب آریہ شمال مغربی دروں کو عبور کرکے پنجاب پہنچے تو ان کے سیدھے ہاتھ کی جانب جو وسیع قطعہ نظر آیا اُسے انھوں نے دکھشن کا نام دیا۔ اس لفظ کا اطلاق خیرات پر بھی ہوتا ہے، جو سیدھے ہاتھ سے دی جاتی ہے۔ اور پھر اس سمت کو دکھشنڈا کہنے لگے۔ پراکرت میں یہ لفظ دکھن ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے دو حصے قرار پائے، آریہ ورت جس پر آریوں کا قبضہ تھا اور دوسرا دکھشنڈا پیٹھ۔

دکن میں شمالی بولی کے رواج پانے کے کچھ ہی عرصہ بعد یعنی ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی جس میں اس زبان کو ترقی کے پورے مواقع ملے۔ بہمنی سلطنت کے قیام سے پہلے ہی مسلمان مبلغوں اور اولیا کرامؒ نے دکن آکر اپنے اصولوں کا پرچار شروع کر دیا تھا اور شعوری طور پر اس زبان کی بھی ترویج کر رہے تھے جس کا انھوں نے انتخاب کیا تھا۔

دکن میں دیسی اور پردیسی دونوں نے اس کو استعمال کیا۔ دیسیوں نے اردو کی پیشرو کو حکمرانوں کی زبان قرار دیا۔ چنانچہ تلگو میں اس زبان کو آج تک "ترکا ماٹا" یعنی ترکوں کی زبان کہا جاتا ہے۔ اس طرح دکن بھی اس بولی کا مرکز بن گیا جو شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھی اور یہاں اس کو آزادانہ نشو ونما پانے اور دوسری علاقہ واری زبانوں سے استفادہ کرنے کے مواقع ملے۔ دوسری علاقہ واری زبانیں اس درجہ پر نہ تھیں جو اردو کی اس پیشرو کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بنتیں۔ اس طرح جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا۔ دکن میں اردو کی پیشرو کو دکھنی لہجہ اور مقامی الفاظ کے داخل ہونے سے دکھنی کہنے لگے۔

زین الدین دولت آبادی جو عربی اور فارسی کے عالم تھے ان کا انتقال ۱۳۰۸ء میں ہوا۔ انتقال سے کچھ دیر پہلے عالم نزع میں جب مریدان نے ان کو جگا کر جانشینی کا مسئلہ طے کروانا چاہا تو ان کی زبان سے نکلا "مجھے مت ستاؤ"

اردو زبان شمال میں سترھویں صدی کے آخری ادبے تک محض بات چیت اور کاروبار تک محدود رہی اس کے برخلاف دکھنی زبان نے چودھویں صدی عیسوی ہی سے ادبی صورت اختیار کرلی تھی اور اس میں تصنیف وتالیف کا آغاز ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے سب سے قدیم ثابت ہوئے ہیں۔ ان رسالوں اور "معراج العاشقین" سے اردو نثر کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔

موجودہ تحقیق کی روشنی میں امین الدین علی اعلیٰ کی نثری کتاب "کلمۃ الاسرار" کو اردو کی پہلی مستند نثری کتاب قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس نوبت پر تاریخ ادب کی ایک گتھی سامنے آتی ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا شمالی ہند سے پہلے دکن میں کیونکر ممکن ہوسکی۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام اہل نائط نے کیا جو حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضؓ کی اولاد سے ہیں اور ۵۲۱۲ء سے ۱۲۹۸ء کے درمیان ہجرت کر کے ساحل مالابار آئے اور کوکن وغیرہ میں مقیم ہوئے۔ اہل نائط فن جہاز رانی سے واقف تھے اور سمندروں میں مسلمانوں کی سیادت انہی کے توسط سے قائم تھی۔ دیرینہ تعلقات کی وجہ سے وہ جنوبی ہند سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے یہاں مستقل توطن اختیار کیا اور یہاں آنے کے بعد تجارت کے علاوہ تبلیغ اسلام کا کام انجام دیا۔ علم کی ترویج میں بھی اہل نائط کا حصہ رہا۔ دکھنی جو اس وقت جنوبی ہند کے مسلمانوں کی زبان بن گئی تھی اس کو اہل نائط نے اختیار کیا۔ مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ جماعت نے جب اس اجنبی زبان کو ملکی اور مادری زبان قرار دیا تو یہ ایک اہم اقدام تھا۔ شمالی ہند کے حکمرانوں کیلئے یہی قومی زبان علاقہ واری زبان بھی تھی۔ اس کے برخلاف اہل نائط کیلئے اس زبان کے علاوہ علاقائی زبان کا سیکھنا ضروری تھا خواہ وہ مراٹھی ہو یا کنڑی تلگو ہو یا تامل یا ملایالم۔ عربی زبان کو بھی وہ چھوڑ نہ سکتے تھے فارسی زبان سے واقفیت بھی لازم تھی۔ اہل نائط نے چار زبانوں کو اپنایا۔ یہ اقدام بڑے مضرات اور دور رس اثرات کا حامل ہوا۔

اہل نائط ہی اردو کی بیشرو کو ادبی زبان بنانے کے موجب ہوئے۔ شمالی ہند میں عوامی بولی کے خلاف پڑھے لکھے لوگوں کا تعصب اور اس کو حقیر سمجھنا فطری بات تھی کیونکہ یہ زبان محکوم طبقہ کی زبان تھی۔ ایسا کوئی تعصب دکن میں نہ تھا، جہاں یہ بولی اجنبی ہونے کی وجہ سے علاقائی بولیوں پر فوقیت رکھتی تھی جب اہل نائط نے اس کو قبول کرلیا تو وہ پھر جلد ہی ادبی زبان بھی بن گئی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) نے جو شہنشاہ اکبر کا ہمعصر تھا ہندی کو سرکاری زبان کا رتبہ دیا۔ اس کی مشہور تصنیف کتاب "نورس" ہندی گیتوں کا مجموعہ ہے۔

ابراہیم قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) کے دور میں دکھنی زبان کی ابتدائی اثرات ملتے ہیں لیکن اس کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) نے اس کی خاص سرپرستی کی۔ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے دیوان میں ہندی الفاظ کو فارسی عربی الفاظ کے ساتھ ایک خاص انداز سے سموکر زبان کے ارتقا میں خاص حصہ لیا۔ عبداللہ قطب شاہ (۱۶۱۴ء تا ۱۶۷۲ء) بھی دکھنی زبان میں شعر کہتا تھا۔ اس کے عہد میں وجہی، غواصی اور دوسرے ممتاز شعرا اور نثر نگاروں نے دکھنی زبان کو فروغ دیا۔

اردو نے برصغیر کے ہر علاقہ سے دل کھول کر فیض اٹھایا ہے لیکن دکن کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں سے اردو کے پہلے دور کی ابتدا ہوئی اور شمالی زبان کی بول چال کی زبان نے یہاں تحریری جامہ پہنا اور علمی اور ادبی وقار حاصل کیا۔

اردو زبان کے آغاز کے متعلق صحیح نتائج اخذ کرنے میں دکھنی کے قدیم ذخائر کی کھوج سے بڑی مدد ملی اسی لیے ان ذخائر کی بازیافت لسانی اعتبار سے اہم ہے۔

قدیم الفاظ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے اولین شاعر اور ادیب الفاظ کو کس املا سے لکھتے تھے۔ اور کس تلفظ سے ادا کرتے تھے اور ان کے اصول و قواعد کیا تھے، برصغیر کی علاقائی زبانوں کا اردو کی تشکیل میں کیا حصہ رہا ہے اور اردو زبان کن کن مراحل سے گزری ہے۔

آج بھی قدیم اردو کے کئی ہزار الفاظ علاقائی زبانوں میں موجود ہیں اور علاقائی اردو بولنے والے بھی ان کو استعمال کرتے ہیں۔ ان خوابیدہ الفاظ کو دوبارہ استعمال کر کے اردو کو برصغیر کی علاقائی زبانوں سے قریب کیا جاسکتا ہے۔

یقین ہے کہ حیدرآباد اردو لغت شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ لسانیات، قواعد اور علم الانسان کے ماہرین کے لیے نئے فکری راستے کھولے گی۔

دکھنی کی اہم تصنیفات کی بازیافت اور تدوین میں مستشرقین کا اہم رول رہا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی، انگریز مستشرق ڈبلیو۔ بی۔ کیر، جرمن مستشرق اسپرنگر، انگریز مستشرق جان شیکسپیر، انگریز مستشرق بوم بارٹ، انگریز مستشرق ایچ اور مستشرق اسٹوارٹ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان علما نے اردو تصانیف کو شمالی ہند اور جنوبی ہند میں تقسیم کیا۔ بقول پروفیسر

اکبرالدین صدیقی " گراہم بیلی پہلا مصنف ہے جس نے اپنی تاریخ ادب اردو میں دکھنی کے مصنفین کا تفصیل سے ذکر کیا ہے"، "دکھنی کے تعلق سے ماہرین لسانیات میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض دکھنی اور اردو کو زبان کی دو علٰحدہ شاخیں تصور کرتے تھے لیکن دکھنی کے محققین عبدالجبار ملکاپوری، حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر اکبرالدین صدیقی کے قابل قدر کارناموں نے ان شبہات کو ہمیشہ کیلئے دور کردیا۔ دیگر جامعات کے دکھنیات سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ نے بھی قابل قدر خدمات انجام دیے ہیں۔

جب کسی موضوع پر مختلف انداز سے اور مختلف پہلوؤں سے بڑے پیمانہ پر لکھا جاتا ہے اور تنقیدیں کی جاتی ہیں تب یہ سب ذخیرہ ایک باضابطہ علم کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ قریبی زمانہ میں دو عظیم شاعروں غالب اور اقبال کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا، ان تمام تحریرات کو علی الترتیب غالبیات اور اقبالیات کا نام دیا جاتا ہے۔ جب حضرت امیر خسروؒ کی سات سو سالہ تقریبات منائی گئیں تو میں نے تحریک کی کہ خسرویات کو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اور علم کی حیثیت سے ترقی دی جائے اور اس کی افادیت کو پوری طرح واضح کیا جائے۔

اب وقت آگیا ہے کہ دکھنیات کو علم کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اب تک علم لسانیات میں دکھنیات سے ویسا استفادہ نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کا حق تھا۔ ضرورت ہے کہ دکھنی ادب پاروں کا بڑے پیمانہ پر علمی تجزیہ کیا جائے۔ جو مخطوطے اس وقت تک ایڈٹ نہیں ہوئے ہیں انھیں ایڈٹ کیا جائے۔ جو کتابیں ایڈٹ ہو کر سامنے آچکی ہیں ان پر مزید تحقیقی نظر ڈالی جائے۔ ایسا کرنے سے تاریخ اردو ادب کے نئے گوشے سامنے آنے کا قوی امکان ہے۔ اس وقت تک دکھنی الفاظ کی چھان بین اور ان کے مآخذ کی تلاش کا کام خاطر خواہ نہیں ہوا ہے۔ یہ سب کام دکھنیات کا جز قرار پاتے ہیں۔

حیدرآباد اردو لغت بیک وقت علاقائی اردو لغت بھی ہوگی اور قدیم اردو لغت بھی۔ روایت و اثرات کے اعتبار سے اردو زبان اور اس کے ادب کے تین بڑے ادوار میں سے یہ لغت پہلے دور کی تخلیقات کا احاطہ کرے گی جو نویں صدی ہجری سے تحریری شکل میں نظر آتا ہے۔ اس دور میں گجرات کو چھوڑ کر صرف دکن ہی میں شاعری اور نثری ادب کی ابتدا ہوئی۔

اس دور میں بقول جمیل جالبی " زبان و ادب ہندوی زبانوں کے الفاظ، تلمیحات، اساطیر، علامات تشبیہات اور اصناف و اوزان سے استفادہ کرتے رہے۔ یہ عمل مسعود سعد سلمان (۱۱۲۱ء) سے لے کر امیر خسرو

(۱۳۴۵ء) سے ہوتا ہوا گجرات اور دکن میں دسویں صدی ہجری تک جاری رہتا ہے۔"

حیدرآباد اردو لغت کی تدوین کے سلسلہ میں پہلا کام یہ ہوگا کہ اس وقت تک دکنی اردو لغت پر جو کام ہوئے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ یہاں مختصر ذکر پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔



شاہان سلف کسی شخص کو اراضی نقد رقم یا رعایا سے نقد رقم وصول کرنے کا حق عطا کرتے تھے تو اس کو انعام کہا جاتا تھا۔ دکن میں انعام یا عطیات کے تعلق سے بے شمار الفاظ رائج ہیں۔ اسی طرح مالگذاری کے تعلق سے سینکڑوں الفاظ ہیں جو دوسرے علاقوں میں مروج نہیں

میرے جد امجد شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولاؔ نے ریاست حیدرآباد کے ۱۶۳۹ اصطلاحات ملکی سررشتہ مال وعدالت وکوتوالی وفوج وغیرہ کو یکجا کرکے ان کی تعریفات بیان کی ہیں۔ یہ کتاب "مصطلحات دکن" کے نام سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ حضرت ولاؔ نے اپنی دیگر تصانیف "مجموعہ قوانین مالگزاری"، "اعظم العطیات"، "سیاق دکن" وغیرہ میں بھی دکن کی اصطلاحات ملکی کی تعریفات شامل کی ہیں۔ حضرت ولاؔ کو اس اہم کام کی حد تک اولیت حاصل ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دکنیات کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ دکنی ادب پاروں "سب رس"، "قطب مشتری"، "گلشن عشق" کو مرتب کرکے شائع کیا اور "پھول بن" کو بھی شائع کیا جسے شیخ چاند حسین (محکمہ تعلیمات بمبئی) نے مرتب کیا تھا۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے "پھول بن" اور "کلیات سراج" کو اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" کو مرتب کرکے شائع کیا۔ ان میں ہر دکنی لفظ کے نیچے بین السطور معنی درج کر دیے ہیں علاحدہ فرہنگ ترتیب نہیں دی۔

پروفیسر اکبرالدین صدیقی نے "ارشاد نامہ"، "کلمۃ الحقائق"، "چندر بدن و مہیار"، "پھول بن" اور "انتخاب کلام محمد قلی قطب شاہ" کو بعد تدوین شائع کیا ہے۔ ہر کتاب کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عبدالرحمن پارکر نے "نقش دلپذیر" کی جلد اول میں ۳۴ اردو شاعروں کے کلام کا انتخاب شامل کیا ہے۔ اس میں سات دکنی شاعروں کے کلام کا انتخاب محمد اکبرالدین صدیقی نے کیا۔ اس کتاب کی تحقیق و تدوین حکومت ریاست ہائے متحدہ کی مالی امداد سے تکمیل کو پہنچی۔

ڈاکٹر سید جعفر نے دبستان گولکنڈہ کی پہلی مثنوی "یوسف زلیخا" بعد تدوین شائع کی تو اس کے آخر میں ۴۰ صفحات

پر مشتمل فرہنگ کو شامل کیا ہے۔

سید مبارز الدین رفعت نے بیجاپور کے آٹھویں عادل شاہی فرمانروا سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی تخلص کے دکنی، ہندی، فارسی کلام کا مجموعہ شائع کیا تو اس کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے دکنیات میں دلچسپی لی، اور شاہ تراب کی کتاب "من سمجھاون" کو ایڈٹ کیا۔ موصوف نے قدیم دکنی لغت بھی تیار کی ہے جس کو مسلمانوں کی بول چال کی زبان کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے "کلمۃ الاسرار" اور "سب رس" کی تنقیدی تدوین کی اور دونوں کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا ہے۔

دکنی اردو کی لغت پروفیسر مسعود حسین خاں اور غلام عمر خاں نے مرتب کی۔ اس میں چھ سات ہزار الفاظ شامل ہیں۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد کی اردو مشاورتی کمیٹی نے پروفیسر مسعود حسین خاں کی تیار کردہ اسکیم کی مکمل تائید کی اور جب یہ لغت مکمل ہوئی تو آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"یہ قدیم دکنی اردو کی لغت ہے جس کا تمام تر مواد اس زبان کے مخطوطات اور مطبوعات سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس قسم کا کوئی کام اب تک تجویز ہوا نہ مکمل کیا گیا۔ تاہم مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس کی حیثیت نشان راہ کی ہے منزل کی نہیں۔"

اس لغت میں دکنی لفظ کے ساتھ اردو میں اس کے معنی دیئے گئے ہیں۔ پھر اصل متن کا جملہ یا شعر درج ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور مطبوعہ کتاب یا مخطوطہ کا مخفف حوالہ دیا گیا ہے۔ ابتدا میں ۲۶۸ مطبوعات اور مخطوطات اور ان کے مخففات کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ لغت تین سو اکیاسی ۳۸۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کی ہوئی "قدیم اردو کی لغت" مرکزی اردو بورڈ لاہور کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ لغت قدیم اردو کے تقریباً گیارہ ہزار الفاظ اور ان کے معنی پر مشتمل ہے۔

اشفاق احمد نے تعارف میں لکھا کہ "مولف نے دسویں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط تک کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کو جانچ کر ان میں سے ان الفاظ اور تراکیب کو بطور خاص اس لغت میں شامل کیا ہے جن کے مطالب اور معنی قدیم اردو ادب کے استادوں اور طالب علموں پر آسانی سے کھلتے نہ تھے۔"

جمیل جالبی نے پیش لفظ میں "قدیم اردو کی لغت" کو اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی لغت قرار دیا ہے۔

اس لغت میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو اردو زبان کی پہلی باقاعدہ تصنیف "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں استعمال ہوئے ہیں اور وہ الفاظ بھی جو گجری اردو کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ وہ الفاظ بھی جو عادل شاہی اور قطب شاہی دور کی تصانیف میں نظر آتے ہیں اور وہ بھی جو پاکستان اور شمالی ہند میں لکھی جانے والی تصانیف میں ملتے ہیں۔

اس لغت کی تیاری میں جہاں کم و بیش قدیم ادب کی ساری مطبوعہ کتب سے استفادہ کیا گیا ہے وہاں سیکڑوں قلمی بیاضوں اور مخطوطات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

پیش لفظ میں لائق مرتب لکھتے ہیں کہ "ہر وہ لفظ جو قدیم ادب میں استعمال ہوا ہے اسے معنی اور حوالہ کے ساتھ ایک کارڈ پر لکھ کر رکھ لیتا یہ کام ۱۹۶۱ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا تھا جب کام ختم ہوا تو تقریباً اٹھارہ ہزار الفاظ کا ذخیرہ میرے پاس تھا۔ اس ذخیرہ کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان الفاظ کو مرتب کر دیا جائے تو یہ لغت ان لوگوں کے لیے یقیناً مفید ثابت ہو گی جو قدیم اردو کی مطبوعہ کتب، مخطوطات اور قلمی بیاضوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں"۔

پیش لفظ کے آخر میں جمیل جالبی نے نہایت بلند حوصلگی سے اعتراف کیا ہے کہ دنیا میں کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔

انجمن ترقی اردو کراچی کی جانب سے لغت کبیر کا کام ہو رہا ہے جس میں دکنی الفاظ کو شامل کرنے کا منصوبہ ہے۔

لکھے ہوئے الفاظ کے علاوہ بولے جانے والے الفاظ کی بھی اہمیت ہے۔ دکن کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی دکنی الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شری رام شرما نے کرناٹک اور مہاراشٹر کے مختلف اضلاع میں گھوم پھر کر کہانیوں اور گفتگو کو صدا بند کیا۔ ان کیسٹوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح مزید بول چال کی زبان کو محفوظ کر کے دکنی الفاظ کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شرما نے اپنی کتاب "دکنی زبان کا آغاز و ارتقاء" کے ضمیمہ میں "دکھنی کے مادوں کا مطالعہ" کے زیر عنوان ۵۹۴ مادوں کی فہرست دی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ غلام رسول نے کیا۔ اسی طرح دکنی اور جدید پنجابی کے الفاظ اور قواعد میں جو یکسانیت ہے اس پر علمی اور تحقیقاتی توجہ کی ضرورت ہے دکنی گیتوں اور مزاحیہ شاعری میں بھی دکن کے الفاظ ملتے ہیں اور ان کا خاص استعمال معلوم ہوتا ہے۔ ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی کام کی حیثیت سے مطبوعات اور مخطوطات کی جامع فہرست مرتب کرنی ہو گی۔

یہاں چند فہرستوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

دکنی ادبیات کے ماہر نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ لائبریری اور کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطات کی فہرست چھ جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے دکنیات پر مرتب شدہ کتابوں کی فہرست مرتب کی ہے۔

افسر امروہوی نے انجمن ترقی اردو کراچی کے مخطوطات کی فہرست چھ جلدوں میں مرتب کی۔ رضا لائبریری رامپور کے مخطوطات کی فہرست بھی مرتب ہوئی ہے۔ ساری فہرستوں سے دکنی مخطوطات کی فہرست مرتب کرنی ہوگی۔ برصغیر سے باہر جو دکنی مخطوطات ہیں ان کی فہرستیں بھی مرتب کرنی ہوں گی۔

• •

ڈاکٹر ایرکان ترکمان
رئیس شعبۂ اردو، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ (ترکی)

یونس امرہ

ترکی کے سب سے پہلے صوفی شاعر

قونیہ میں میرام کے باغوں میں جب مولانا جلال الدین کی مثنوی کے اثر سے لوگ دیوانوں کی طرح مست ہو کر حال کھیلنے لگتے تو سادہ لوح ترک جن کو فارسی نہ آتی تھی وہ مایوسی کے ساتھ ان کے جوش و خروش کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہ جاتے تھے۔ خدا کی رحمت نے ان پر بھی ترس کھایا اور عام لوگوں کی زبان ترکی میں عشق خدا پر شعر لکھنے والے ایک ولی کو بھیجا جن کا نام امرہ اور تخلص یونس تھا۔ یونس کے ترکی اشعار میں اللہ کی محبت اس قدر صاف اور ستھری زبان میں پیش کی گئی ہے کہ سادے سے سادہ انسان بھی ان کے کلام کو سمجھ سکتا ہے۔

آج جب کہ سلجوقیوں کا فارسی زمانہ بہت پیچھے رہ چکا ہے ان کی ترکی شاعری نے اللہ والوں کے دلوں میں عشق خدا کی چنگاری کو زندہ رکھا ہے۔ ترکی میں کوئی ایسا گھر نہ ہوگا جس میں ان کے اشعار پڑھے نہ جاتے ہوں۔

یونس کو پیر کامل رومیؒ سے عقیدت تھی اور ان سے فیض بھی حاصل کیا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

"مولانا خداوندگار کی نظریں جب سے ہم پر پڑیں ان کی پُرعظمت نگاہیں ہمارے دل کا آئینہ ہیں۔"[1]

وہ رومیؒ کے ہم عصر اور ترکی کے سب سے پہلے صوفی شاعر ہیں۔ ان کے رسالے "رسالۃ النصیحہ" کے اختتام پر جو تاریخ ملتی ہے وہ رومیؒ کی ہم عصری کا ثبوت ہے: "اور تاریخ تو سات سو سات ہی تھی (۷۰۷ ہجری) جب یونس نے اپنی جان اس راہ میں فدا کی تھی۔"[2]

یونس کے حالات زندگی

درویش شاعروں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے ان کی تصانیف میں ان کے حالات زندگی کے متعلق کوئی زیادہ مواد نہیں ملتا۔ یونس کی بھی یہی حالت ہے۔ ان کی زندگی کے حالات زیادہ تر روایتوں پر مبنی ہیں۔ ہم ان ہی حالات کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

یونس رومیؒ کی طرح وسط ایشیا سے کوچ کر کے اناطولیہ آئے اور قونیہ کے گرد و جوار میں گھومتے رہے۔ بڑے عرصے تک ایک جگہ مقیم نہ ہوئے۔ ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آذربائیجان، شام، عربستان اور سارے اناطولیہ

۱۔ عبدالباقی گولپنارلی، دیوان یونس امرہ، استنبول ۱۹۶۵، ص ۱۶۱۔ ۲۔ عبدالباقی، ایضاً، ص ۳۷۔

کا چکر لگاتے رہے۔ آپ چونکہ خانہ بدوش ترکمان تھے اس لئے سلطنت سلجوقیہ کے پائے تخت قونیہ کے گرد و نواح میں جہاں جہاں ترکمان سپاہی ملتے تھے آپ وہاں جا ٹھہرتے تھے۔ قونیہ کے قریب ایک شہر جس کا نام قرہ مان ہے یونس کا وطن ہوا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں رومی کے والد آ کر رہے تھے۔ رومی کی والدہ بھی یہیں مدفون ہیں۔

عوام میں ایک مشہور روایت

کہا جاتا ہے کہ ایک سال قحط پڑ گیا اور یونس کے گاؤں والے بھوکے مرنے لگے تو یونس اپنے زمانے کے برگزیدہ ولی حاجی بکتاشی[۱] کے پاس گئے اور ان کے حضور میں جا کر سوال کیا تو بکتاشی نے پوچھا "بتاؤ بیٹا آپ کو نظر چاہیئے یا گندم؟" بے چارے یونس نے سوچا کہ نظر کس کام کی چیز ہے گندم ہی کیوں نہ لے لوں جس سے بھوکے لوگوں کا پیٹ بھر جائے۔ تو گندم ہی مانگی۔ جب گھر کا راستہ پکڑا تو راستے میں کسی نے کہا "بھائی گندم کی جگہ ایک ولی کی نظر کئی گنا قیمتی ہوتی ہے" تو پشیمان ہو کر واپس لوٹے اور بکتاشی کی خدمت میں جا کر معافی مانگی اور نظر چاہی تو پیر نے کہا اب جاؤ اور تاپتوک امرہ[۲] کی خدمت میں رہو وہاں تم کو فیض مل جائیگا۔ اس پر وہ ان کی خدمت میں گئے اور وہاں پر چالیس سال کاٹے اور نفس امارہ کو مارنے کے لئے ریاضت شروع کی درگاہ کے لیے لکڑیاں لاتے رہے۔ لکڑیاں کبھی ٹیڑھی نہ لاتے تھے۔ ایک دن ان کے پیر نے پوچھا "کیوں یونس صاحب ٹیڑھی لکڑیاں کبھی نہیں لاتے؟" تو جواب دیا "آقا آپ کے دربار میں کوئی ٹیڑھی چیز نہیں ملتی اسلیے لکڑیاں کیوں ایسی ہوں!"

ایک دن آپ نے پیر تاپتوک امرہ کی خوبصورت پاک دامن لڑکی کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو دل دے بیٹھے لیکن شرم و حیا اس قدر تھی کہ ان سے شادی نہ کی بس عشق میں جلتے رہے۔ ایک اور روایت بھی مشہور ہے جب یونس رومی کے حضور میں گئے تو سوال ہوا "بتایئے کیا آپ کو ہماری مثنوی پسند آئی؟" تو یونس نے جواب دیا "پیر کامل! آپ نے بات ذرا لمبی کر دی ہے حالانکہ اتنا کہنا کافی تھا 'گوشت اور ہڈیوں کا لباس پہن کر میں آیا ہوں یہاں یونس ہو کر'" یہ روایت درایت (ادب) کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔[۳]

آپ کی وفات اور مزار شریف

آپ کے کئی مزار پائے جاتے ہیں لیکن سب سے مشہور "قرامان" اور اس کے شہر کے ہیں۔ آپ کا انتقال ۷۲۰ ہجری میں ہوا۔

۱۔ جاہد اوتونالی 'یونس امرہ' انقرہ ۱۹۷۷، ص ۱۔ حاجی بکتاشی (۱۲۷۰ - ۱۲۰۹) خراسان سے ترکی آئے تھے۔ ترکستان کے مشہور ولی احمد یسوی کے مرید تھے۔ ان کا مزار ترکی میں قرشہر میں ہے۔ مناقب العارفین میں بھی ان کا ذکر آتا ہے (دیکھئے شمس الدین احمد الافلاکی تحسین یازیجی چاپخانہ انجمن تاریخ ترک انقرہ ۱۹۵۹ ص ۳۸۱، ۳۸۳، ۴۹۸)۔ ۲۔ تاپتوک امرہ بھی ایک ولی کا نام ہے جو یونس کے پیر خیال کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر فواد کوپرولی 'ترک دنیاتندہ الک متصوفلار' دیانت اشتری بکانلغی' انقرہ ص ۲۷۱۔

تصانیف یونس کی سب سے بڑی تصنیف انکا ترکی دیوان ہے۔ اس دیوان میں ۳۵۰ کے لگ بھگ غزلیں ملتی ہیں۔ یونس کا ایک چھوٹا سا رسالہ بھی ہے جس کا نام "رسالۃ النصیحہ" ہے۔

افکار آپ کے اشعار میں زیادہ تر متصوفانہ فکر اور عشق الٰہی بہت ہی سادی ترکی میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ یونس بالکل امی تھے غلط ہے[1] کیوں کہ ان کے اشعار میں فارسی اور عربی کے ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو ان پڑھ آدمی کے منہ سے نہیں نکلتے دینی اور متصوفانہ معلومات بھی اتنی بلند پایہ ہیں کہ ان کا ان پڑھ ہونا محال نظر آتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آجکل بعض مستشرقین خدا پرست اور عاشقان رسول کو انسان شناسی (HUMANiST) کا دھبا لگا کر اسلام سے دور کر دیتے ہیں۔ امریکہ کے ایک مشہور ترکی پروفیسر یونس کو بین الملل شخصیت کا خطاب دیتے ہیں[2]۔ حالانکہ یونس کو خدا اور اس کے رسولؐ کے راستے پر چلنے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ اسلامی تصوف کی بو اور نور محمدی کی خوشبو مہکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہاں یہ بات کچھ اور ہے کہ اسلام خود بین الملل حیثیت رکھتا ہے۔ اب قارئین کی دلچسپی کے لیے یونس کے ترکی کلام کا ترجمہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

مناجات

پہاڑوں کے ساتھ پتھروں کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولیٰ
صبح کے وقت پرندوں کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولیٰ

پانی میں مچھلیوں کے ساتھ، صحرا میں آہوں کے ساتھ
دیوانہ ہو کر یا ہو کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولیٰ

آسمانوں میں عیسیٰؑ کے ساتھ، کوہ طور پر موسیٰ کے ساتھ
ہاتھوں میں عصا کے ساتھ، تجھے پکاروں میرے مولیٰ

درد بھرے ایوب کے ساتھ، روتے ہوئے یعقوب کے ساتھ
اور محمد محبوبؐ کے ساتھ، تجھے پکاروں میرے مولیٰ

حمد و شکر اللہ کے ساتھ، وصف قل ہو اللہ کے ساتھ
دائم ذکر اللہ کے ساتھ، تجھے پکاروں میرے مولیٰ

۱۔ پروفیسر فواد کوپرولی، ترک ادبیاتندہ الک متصوفلار، دیانات اشلری بکانلغی انقرہ ص ۲۷۱۔ ۲۔ یونس امرہ، طلعت حالمان، انڈیانا یونیورسٹی نمبر ۲ اور آر۔ سی۔ ڈی پبلیکیشن نمبر ۳۱۹۔

جانتا ہوں دنیا کے حال کو، ترک کیا میں نے قیل وقال کو
سر برہنہ اور ننگے پاؤں، تجھے پکاروں میرے مولی
یونس تجھے پکارے زبان سے بلبل اور قمری کے ساتھ
خدا کے چاہنے والوں کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولی

نعت رسولؐ

ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب تیرا سراغ مل جائے، تیرے قدموں کی خاک منہ پر پھیروں
خدا کرے تو دیکھوں تیرے چہرۂ مبارک کو، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری
ایک ذرہ بھر نہیں ہے میرا حیلہ، صدق کے ساتھ ہوں میں اس راستے پر نکلا
ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ سے بھی واقف ہوں، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری
علیؓ اور حسنؓ حسینؓ جب وہاں ہوں، جب دل میں محبت جان میں الفت ہو
کل محشر کے دن بڑے دربار میں، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری
یونس کی زبان نے حمد و ثنا کی تیری، سارے دلوں میں ہے بھری محبت تیری
روتے روتے اس پردیس میں، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری[1]

رومی کی طرح یونس بھی پیار اور الٰہی عشق کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ زہد کو امید اور خوف کے درمیان ایک کشمکش قبول کرتے ہیں۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں: "زاہد کو اپنی عبادت پر ناز ہے لیکن عاشق کے سامنے اس کے محبوب کا چہرہ کعبہ کی طرح ہر دم سامنے نظر آتا ہے۔" شعر کا ترجمہ یہ ہے:

عشق ہے امام میرا، دل ہے میرا مسجد — یہ چہرۂ جاناں ہے کعبہ مجھے ہر دم یہاں[2]

یونس کا عشق صرف اللہ ہی کے لیے ہے وہ جنت کی حوروں کے بجائے خدا ہی کے طالب ہیں۔

تیرے عشق نے مجھے مجھ سے چھینا، مجھے تو ہی چاہیے مجھے تو ہی چاہیے
میں جلتا ہوں ہر دم تیرے ہی لیے، مجھے تو ہی چاہیے، مجھے تو ہی چاہیے
ہے مجھ کو نہ دولت نہ ثروت عزیز، نہ فقیری پر ناز نہ عشرت عزیز
صوفیوں کو ہے ہر دم صحبت مطلوب، درویشوں کو بھی ہے آخرت محبوب

۱۔ ایضاً ص ۱۱۹ ۲۔ احمد قباقچی یونس امرہ طوقر یایتری استنبول ۱۹۷۵ ص ۱۵۰

مجنوں کو ہے لیلیٰ کی جستجو، مجھے تو ہی چاہیے، مجھے تو ہی چاہیے

جنت چند باغوں کا نام ہے، کوٹھیوں اور حوروں کا مقام ہے

جو طالب ہوں ان کے انہیں بخش دے، مجھے تو ہی چاہیے، مجھے تو ہی چاہیے

یونس جب سے میرا نام ہے، دل میں میرے سلگتی تیری آگ ہے

دو جہانوں میں ہے مجھ کو تو ہی مقصود، مجھے تو ہی چاہیے، مجھے تو ہی چاہیے[1]

عشق خدا سے جو یونس کی حالت ہوئی وہ یوں بیان کرتے ہیں:-

میرا دل جب سے گرفتار عشق ہوا، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

میرا سر اس راہ میں فدا ہو گیا، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

میں چلتا ہوں اس راہ میں جلتے جلتے، عشق نے تیرے مجھے خون سے رنگایا

اب میں نہ عاقل ہوں نہ دیوانہ، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

کبھی گھومتا ہوں ہواؤں کی طرح، کبھی غبار اٹھاتا ہوں راہوں کی طرح

کبھی بہتا چلتا ہوں دریاؤں کی طرح، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

میں یونس ہوں اور بے چارہ ہوں، سر سے پاؤں تک زخموں کا مارا ہوں

دوستی کی خاطر اس طرح آوارہ ہوں، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا[2]

عشقِ خدا کے سامنے اس فانی وجود کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

جان جاناں کو دیکھا، میری جان نکل جائے

ہوا سود و زیاں سے فارغ، میری دوکان جل جائے

میں خودی سے جا نکلا، حجاب چشم کو پھاڑا

وصالِ یار کی خاطر، میرا گمان ٹل جائے

دو ہونے سے میں اکتایا، وحدت کے گھرانے میں

شراب عشق کو پی کر، میرا درمان ٹل جائے

۱۔ پروفیسر تیمور تاشش، یونس دیوانی، منسٹری آف کلچر اینڈ ٹورزم انقرہ ۱۹۸۶ء ص ۲۰۹

۲۔ شوکت راد، یونس امرہ، دور غان قردش، ۱۹۷۲ء ص ۳۱

یونس نے خوب فرمایا، شکر و شہد سے کھایا
شہد کے شہدوں کو جب پایا، تو یہ چھتا پگھل جائے[1]

اولیا ہند و پاکستان کی طرح (مثلاً بابا فرید شکر گنج، بھلے شاہ، نظام الدین اولیا وغیرہ) یونس کے بھی اشعار نصیحت آمیز ہیں۔ یونس غفلت کے خواب میں سونے والوں اور اس دنیا کے مال و متاع میں مگن ہونے والوں کو پکار کر یوں کہتے ہیں :۔

کیا کرو گے غافل اس دنیا کے مال کو	کیا اسکو خرچ کر دینا تمہارے خیال میں نہیں؟
ہزار سال بھی جیو تو ایک دن ضرور مرنا ہے	کیا مر کر چلا جانا تمہارے خیال میں نہیں؟
پھر سفیدی آئی ہے تمہارے سیاہ بالوں میں	مرنے سے پہلے توبہ کرو گناہوں سے
مٹی کے نیچے اندھیری قبر میں	ایک دن جا سونا تمہارے خیال میں نہیں؟[2]

اور فرماتے ہیں :۔[3]

کوئی مال کا صاحب کوئی ہے ملک کا صاحب	کبھی تمہیں یاد بھی آیا ان کا حقیقی صاحب؟
مال بھی جھوٹا، ملک بھی جھوٹا	آؤ ذرا تم بھی ان سے دل بہلاؤ صاحب

یونس کے اشعار میں جمادات، انسان، والحاصل ساری مخلوقات خدا سے محبت کی تلقین پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ان کے زمانہ میں اناطولیہ کی سیاسی حالت بہت نازک تھی منگولوں نے ملک کو تاراج کر رکھا تھا۔ ترکمان سپاہی ایک طرف منگولوں اور دوسری طرف سے رومیوں سے لڑ رہے تھے۔ یونس بجائے لڑائی کے انسانوں کو صلح اور محبت کا سبق دے رہے تھے۔ یہی حالت مولانا رومیؒ کی تھی۔ یونس فرماتے ہیں۔

"محمد ناراض نہ ہوتے تھے تم کیوں ناراض ہوتے ہو؟ اگر ناراضگی تیری خصلت ہے تو تو درویش نہیں ہو سکتا"[5]

ان کا ایک اور مشہور مصرعہ یہ ہے "مخلوق خدا سے پیار کر خالق کی خاطر"

یونس انسان اور اس کے احساسات کو اہمیت دیتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"یونس امرہ کہتا ہے ملا اگر حج کو جانا ہے تو جاؤ ہزار بار لیکن سب سے بڑی بات کسی کے دل کو مول لینا ہے[6] اور نہ اگر ایک بار تو نے دل کو توڑا تو یہ تیری نماز نماز نہیں"[7]

۱۔ احمد قبا بقلی، ایضاً ص ۳۳۴ ۲۔ شوکت راود، ایضاً ص ۵۰ ۳۔ یہ شعر ترکی میں بہت مشہور ہے ۴۔ احمد قبا بقلی، ایضاً ص ۱۰۲ ۴۔ عبدالباقی، ایضاً ص ۱۹۳
۵۔ ایضاً ص ۱۸۶ ۶۔ ۷۔ قدیم اردو شاعر کا مشہور شعر ہے سے کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ۔ یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا۔

یونس کا سب سے مشہور شعر جو ترکی میں بچوں سے لے کر بزرگوں کی زبان پر ہوتا ہے وہ ان کا یہ شعر ہے جس میں کہتے ہیں کہ خدا کو باہر کیا ڈھونڈتے ہو وہ تو آپ کے اندر ہی موجود ہے :-

مجھے مجھ میں نہ کہیے میں خود میں نہیں ہوں — ایک میں ہے میرے میں کے اندر
جدھر دیکھوں ادھر تو ہی بھرا ہے — تجھے کیسے رکھوں میری جان کے اندر
وہ ایک دلبر ہے جس کا کوئی نشان نہیں — نشان کہاں ملتا ہے نشان کے اندر
کوئی تجلی سے اپنا نصیب لے بیٹھا — کسی کا مقصود ہے اس تجلی کے اندر
تیرے عشق نے مجھے مجھ سے لے ڈالا — یہ کیا میٹھا درد ہے اس درمان کے اندر
شریعت اور طریقت ہیں راہیں جانے والوں کیلئے — حقیقت اور معرفت ہیں نہاں ان کے اندر
کہتے ہیں سلیمانؑ جانتے تھے پرندوں کی زبانیں — ایک سلیمان تھا اس سلیمان کے اندر
ترک دین کرنے والوں کا کام ہے کفر — یہ کیا کفر ہے جو ہے ایمان کے اندر

یونس امرہ جب عشق کی دیگ میں پک کر گل جاتے ہیں تو وحدت کے سمندر میں ان کو موت کا ڈر نہیں رہتا چنانچہ فرماتے ہیں :-

شربت جو حق سے آیا ہم نے پی لیا الحمدللہ — پھر قدرت کے سمندر کو پار ہم نے کر لیا الحمدللہ
خشک تھے گیلے ہوئے پر لگا کر پرندے ہوئے — ہم دو تھے پھر ایک ہی ہوئے اڑنے لگے الحمدللہ

پاک و ہند اور ترکی کے ولیوں کے خیالات میں جو مشابہت پائی جاتی ہے وہ سب وسط ایشیا کی پیداوار ہے۔ ترکستان کے بڑے صوفی شاعر احمد یسویؒ[1] کے متصوفانہ خیالات حاجی بکتاشیؒ، یونس امرہؒ، جلال الدین رومیؒ، بختیار کاکیؒ، شیخ نظام الدینؒ جیسے اولیائے کرام پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں یہ سب ایک ہی مثلث کے دو زاویے ہیں جن کی چوٹی ترکستان کی زمین ہے۔ پاکستان اور ترکی کے صوفی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ان کے درمیان جو روحانی تعلق ہے وہ اور بھی روشن ہو جائے گا۔ ■■

۱۔ عبدالباقی، ایضاً ص — ۔ ۲۔ خواجہ احمد یسوی گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں چینی ترکستان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ شیخ یوسف ہمدانی کے مرید تھے۔ ۱۱۶۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

جناب سید شاہ محمد اسمٰعیل
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

ایک نادر جنتری

جناب وارث اسماعیل عظیم آبادی کا عطیہ ایک نادر تحفہ لائبریری میں موجود ہے۔ یہ ایک تفصیلی جنتری ہے جس کا پہلا تقریباً دو تہائی حصہ مطبوعہ ہے اور باقی حصہ قلمی ہے۔ مطبوعہ حصہ ۱۷۶۴ء تا ۱۸۴۷ء کے سنین پر محیط ہے، یہ نسخہ مطبع مسیح صادق سے شائع ہوا تھا۔ سال طباعت ۱۸۴۷ء ہے۔ قلمی حصہ ۱۸۴۸ء تا دسمبر ۱۸۹۹ء پر محتوی ہے۔

یہ جنتری مندرجہ ذیل چھ سنین پر مشتمل ہے۔ ۱۔ عیسوی، ۲۔ بنگلہ، ۳۔ فصلی، ۴۔ ولایتی، ۵۔ سمبت، ۶۔ ہجری، اس کے بعد سال جلوس بھی دیا گیا ہے۔ جنوری ۱۷۶۴ء تا دسمبر ۱۷۹۲ء کی تاریخیں اجمالی طور پر دی گئی ہیں یعنی ہر ماہ کے لیے صرف چار اندراجات، ۱۷۹۳ء سے مکمل تاریخیں بقید ایام لکھی گئی ہیں یعنی ہر ماہ کیلئے ایک کالم جس میں ۳۰ یا ۳۱ دنوں کی مختلف تاریخیں اور ان کے مطابق ایام تحریر کیے گئے ہیں۔

ابتدا میں پانچ صفحات یعنی ایک دیباچہ ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جنتری مولفہ جان فلمک مارٹن ایڈ صاحب حاکم عدالت صدر دیوانی کلکتہ، انگریزی رسم الخط میں طبع ہوئی تھی، اسی کا یہ ترجمہ ہے۔ جنتری کے اندر مترجم اور مرتب کا نام نہیں مل سکا، مرتب نے دیباچہ میں تمام متذکرہ سنین کی مختصر تاریخ بھی پیش کی ہے، ساتھ ہی بروج و تحویلات کا تعارف بھی کرایا ہے۔ شاہان مغلیہ (تیمور تا بہادر شاہ ظفر) کی تاریخہائے جلوس بقید مقام درج کی ہیں، پھر ایک جدول میں نام ماہ ہائے عربی، ماہ ہائے (ہندی) مشہور در عوام ہند، نام بروج عربی، بروج ہندی، بروج انگریزی، نام ماہ فارسی، ماہ ہائے رومی، ماہ ہائے ہندی اور انگریزی درج ہیں۔ آخر میں چند غیر متذکرہ مشہور سنین کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے اور سال بیرہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اول و آخر مزید ۱۲-۱۲ اوراق ہیں جن پر خاندان کے افراد اور اکابر و اماثل کی تاریخہائے پیدائش و وفات مرقوم ہیں۔ جنتری کے حواشی پر بھی اس نوعیت کے اندراجات کافی ہیں۔ بعض اہم تاریخی شخصیتوں کے انتقال کی تاریخ بھی تحریر کی ہے۔

مثلاً، نواب ہیبت جنگ بہادر برادر زادہ و داماد نواب مہابت جنگ بہادر، اواخر محرم ۱۱۶۱ھ، نواب شہامت جنگ بہادر برادر زادہ نواب مہابت جنگ بہادر، ۱۲ ربیع الاول ۱۱۶۹ھ مادہ تاریخ۔ خدایش بامرزد۔ ۱۱۶۹ھ۔

یہ نسخہ نواب بہادر سید ولایت علی خاں، رئیس عظیم آباد اور ان کی اولاد و احفاد کی ملکیت میں رہا ہے۔ چند اوراق پر نواب صاحب مذکور کی مہریں بھی ثبت ہیں۔ ان کی اور ان کے وارثوں کی متعدد تحریریں بھی ہیں، جن میں نواب سید اسمٰعیل (م ۱۹۴۰ء) اور ان کے صاحبزادے سید وارث اسمٰعیل م ۱۹۸۷ء خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اُردو انٹرنیشنل

اردو ادب اور تنقید کا سہ ماہی مجلہ

ایڈیٹر: اشفاق حسین، ۸۰ اسٹریٹ ویلیٹ سوٹ ۲۰۱ ٹورنٹو اونٹیریو، کناڈا

بین الاقوامی سطح اور یوروپ و امریکہ میں اردو زبان و ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اب ایسے علاقے جہاں اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہے اعلیٰ معیار کے رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ اردو انٹرنیشنل کینیڈا میں مقیم ترقی پسند نوجوانوں کا ترجمان ہے اور صوری و معنوی لحاظ سے اردو کی بہترین رسالوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۲ء سے پابندی سے شائع ہونے والا یہ رسالہ اپنے دامن میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، شارب ردولوی، ممتاز حسین، قمر رئیس اور شہزاد منظر جیسے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سمیٹے ہوئے ہے۔

مشتملات: جلد ۲ شمارہ ۲ (مئی۔ جولائی ۱۹۸۳ء)

افسانے انشائیے: جوگندر پال، اکرام بریلوی، منیر الدین احمد، احمد داؤد، ہرچرن چاولہ، ک۔ حمید ملک، فہیم اعظمی، انور خلیل شیخ۔

منظومات: فیض احمد فیض، قتیل شفائی، نیر جہاں، عبدالاحد ساز، عرفانہ عزیز، انور احسن صدیقی، رضی مجتبیٰ، صلاح الدین محمود، امیر الحسن، خالد اقبال یاسر، عذرا احمد، جنین سید۔

مضامین: جوش و فراق کی یاد میں (فیض احمد فیض) سورج پر دستک، ایک مطالعہ (احمد ندیم قاسمی) مرتضیٰ برلاس (وزیر آغا) اردو شاعری میں نئی تحریر (شارب ردولوی)۔

غزلیں: حبیب جالب، شاذ تمکنت، فارغ بخاری، شاہ نور اختر، شاہین، حسن عابدی، اکبر حیدری، جمیل مدنی، اعجاز اعظمی، حامد جعفری، بدر الدین بدر، وقار ناصری، حمیرا رحمن، اختر لکھنوی، علی عباس امید، جوش ملسیانی، غلام حسین ساجد، ظفر زیدی، لیاقت علی عاصم، عارف امام، جاوید صبا، اسما وارثی، جمال زبیری، اشفاق حسین۔

مشتملات: جلد ۲ شمارہ ۳ (اگست۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

افسانے انشائیے: جوگندر پال، آغا سہیل، زین العابدین، سعید انجم، سائرہ ہاشمی، طاہرہ نقوی، اسما وارثی، ناز،

نظمیں : رئیس امروہوی، وزیر آغا، نازش پرتاب گڑھی، فارغ بخاری، جیلانی کامران، فاروق حسن، شاہد عشقی، منیر الدین احمد، انیس انصاری، واحد بشر، ابرار الحسن، سحر صدیقی، رضی مجتبیٰ، جلیل حشمی، شاہد نقوی، سلمان سعید۔

مطالعہ : شہر مثال کا دردمند شاعر۔ افتخار عارف (گوپی چند نارنگ) احمد فراز۔ بے آوازگلی کوچوں میں (محمد علی صدیقی) راجہ گدھ۔ ایک ناول (آغا سہیل) بے ثباتی بے انت ساگر ابرار الحسن کے شعری مجموعہ پر ایک نظر (اشفاق حسین)

تراجم : چند جاپانی نظمیں : شفیع عقیل، ڈبلیو۔ ایس۔ مرون /شاداب احمد، فولکرن فان ٹورنے /منیر الدین احمد، کارل وبور سکی /منیر الدین احمد، برتھولٹ بریشت /منیر الدین احمد، ایریش فریڈ /منیر الدین احمد، شیخ ایاز /نور محمد شیخ، عبدالحکیم ارشد /نور محمد شیخ۔

غزلیں : احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، انیس انصاری، حامد جعفری، کشور ناہید، شفیع عقیل، شاہین، سلمان اختر، اختر انصاری، مامون ایمن، عرفانہ عزیز، نیر جہاں، اکبر حیدر آبادی، سوہن راہی، ناصر بغدادی، سعید کوکب، اشفاق حسین۔

مشتملات : جلد ۳، شمارہ ۱ (جنوری۔ اپریل ۱۹۸۴ء)

افسانے : انتظار حسین، انور سجاد، قیصر تمکین، سرور جہاں، الطاف فاطمہ، فہیم اعظمی، وصی برنی، فرخندہ بودھی۔

نظمیں : فارغ بخاری، عطا شاد، شفیع عقیل، منیر الدین احمد، فاروق حسن، شاہد عشقی، انیس انصاری، قمر ہاشمی، ابرار الحسن، ادیب سہیل، اکبر حیدر آبادی، شائستہ حبیب۔

مضامین : جدید بلوچی شاعری (قمر رئیس) افریقی ادب (کمال مصطفیٰ) اشفاق احمد کے افسانے (میمونہ انصاری) جدید افسانہ اور علامتی اظہار (ڈاکٹر حامد حسین) پاکستان میں اردو زبان کا احیا (شہزاد منظر) تین خاکے : زیتون بانو، احمد فراز، آغا سہیل (رحیم گل) ابن انشار —— بحیثیت مزاح نگار (کرنل غلام سرور)

غزلیں : احمد ندیم قاسمی، عزیز حامد مدنی، فارغ بخاری، مرتضیٰ برلاس، نازش پرتاب گڑھی، راج نرائن راز، شفیع عقیل، مہدی جعفر، افتخار عارف، ذوالفقار احمد تابش، مامون ایمن، رضی مجتبیٰ، اسرار زیدی، حمیرا رحمان، خالد اقبال یاسر، کلثوم، اعجاز محمدی، عبدالاحد ساز، ستار سید، عشرت حسین، نیلوفر تیموری، صبا اکرام، شاہین بدر، حضرت شاہ، طارق مرزا، جوش ملدوزئی، عابد جعفری۔

مشتملات : جلد ۳، شمارہ ۲ (مئی۔ اگست ۱۹۸۴ء)

افسانے : بانو قدسیہ، زیتون بانو، مظفر اقبال، کے۔ ایم۔ اشرف۔

مضامین : نشان بے نشانی (حنیف فوق) نوشتہ دیوار (حسن عسکری) افریقی ادب —— رجحانات (کمال مصطفیٰ) شعری ماہیت، نثری نظم اور آزاد نظم (مصطفیٰ کریم)

نظمیں: فارغ بخاری، علی عباس امید، نیر جہاں، اسرار زیدی، عرفانہ عزیز، فاروق حسن، مامون ایمن، ابرار الحسن، رشیدہ عیاں، خورشید حسنین، رابعہ برنی، آشفتہ چنگیزی، نزہت صدیقی، خالد سہیل، عذرا احمد۔

غزلیں: فارغ بخاری، حبیب جالب، شاذ تمکنت، شفیع عقیل، نازش پرتاب گڑھی، عبدالقوی ضیاء، افتخار عارف، شاہد رزاقی، نیر جہاں، سلمان اختر، فخر زماں، خالد بشیر، خورشید حسنین، کلثوم اعجاز محمدی، اسد مفتی، جمیل مدنی، سوہن راہی، تسلیم الہٰی زلفی، مجیب ایمان، حضرت شاہ، اسمار وارثی، جاوید اقبال ستار، ضیا شبنمی، خالد سہیل، احمد نوید، وحید دانش۔

یادِ ظفر: ظفر زیدی کی یاد میں خاص گوشہ:

آہ ظفر زیدی (اشفاق حسین) ظفر زیدی ایک سانحہ (مامون ایمن) ظفر زیدی کی یاد میں تقریب (محمد اعجاز) زندہ مومن (حنیف اخگر) ہائے ظفر (منشی کالی چرن اثر) ظفر کی یاد میں (افتخار سحر) میں کیا لکھوں (حمیرا رحمان) سایہ (جاوید عادل رشید) مرثیہ ظفر (راجی سیٹھ) نذر ظفر (جمال زبیری) نذر ظفر (اشفاق حسین) انتخاب: ظفر کی غزلیں، شناخت: ظفر کا افسانہ۔

مشتملات: جلد ۳ شمارہ ۳ (۱۹۸۴ء)

گوشۂ علی سردار جعفری: بچپن سے جوانی تک (علی سردار جعفری) پیراہن شبنم (آنند نرائن ملا) خواب اور شکست خواب (پروفیسر وحید اختر) نیلا فرشتہ (عرفانہ عزیز) نذر جعفری (کیفی اعظمی) نو مبر میرا گہوارہ (علی سردار جعفری)

افسانے: جوگندر پال، جمیل زبیری، ڈاکٹر ابن فرید، سعید انجم، ڈاکٹر خالد سہیل۔

تراجم: کرائے کی کوکھ (مرزا حامد بیگ)۔ ملاپ (ظفر عظیم) سنسکرت کی نظمیں (بیدار بخت / سکندر بخت) مرثیہ (ڈاکٹر منیر الدین احمد)

مضامین: مجروح سلطان پوری کی شاعری (چودھری محمد نعیم) نئی پرانی نظمیں (جیلانی کامران) ادب اور زمینی رشتے (فخر زماں) اردو شعر و ادب مغربی ماحول میں (باقر حسین ضیار)

نظمیں / غزلیں: عنایت حسین شاداں، اعجاز اعظمی، فاروق حسن، واحد بشیر، سلمان سعید، شاہین بدر، طلعت اشارت، بخشی لائلپوری، وقار ناصری، آشفتہ چنگیزی، اکبر نوری جردلی، کلثوم اعجاز محمدی، جوش مندوزئی، عابد جعفری۔

مشتملات: جلد ۴، شمارہ ۱ (جنوری - اپریل ۱۹۸۵ء)

مضامین: پابلو نرودا (علی سردار جعفری) شاعری اور شخصیت (ممتاز حسین) اردو شاعری کا مزاج (رشید ملک)

راجندر سنگھ بیدی اور لاجونتی (مصطفیٰ کریم)

نظمیں: ظہیر صدیقی، عطا شاد، منظر ایوبی، شاہین، نیر جہاں، انیس انصاری، منیر الدین احمد، سجاد بابر، رضی مجتبیٰ، احمد فقیہ، سیدہ نزہت صدیقی، اشفاق حسین۔

افسانے: رشید امجد، سرور جہاں، احمد سعید، جتندر بلو، سعید انجم۔

غزلیں: فضا ابن فیضی، اعجاز اعظمی، عابد ودود، رفیق الزماں، سلمان اختر، ضیار شبنمی، حفیظ جوہر، اولاد رسول قدسی، مسلم شمیم، خالد سہیل، عقیل عباس جعفری، احمد نوید، قیوم طاہر، ریاض الوارث۔

●●

اقبال ریویو/ اقبالیات

ایڈیٹر پروفیسر محمد منور، اقبال اکیڈمی پاکستان ۱۳۹، اے نیو مسلم ٹاؤن لاہور پاکستان

اقبال اکادمی پاکستان کا یہ رسالہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم و فنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انھیں دلچسپی تھی مثلاً اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، ادب، آثاریات وغیرہ۔

اقبال ریویو

مشتملات: جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۱ (اپریل - جون ۱۹۸۶ء)

علم جدید کے مسائل اور قرآن کا فہم (مارٹن لنگس، ترجمہ ابوبکر سراج الدین)، مذہب اشعریہ کا تنقیدی مطالعہ: اقبال اور شووان (SCHUON) کے حوالے سے (شہزاد قیصر)، زندگی کے توہمات (رینا گوینن)، جاوید نامہ میں زندہ رود (ڈاکٹر تارا چرن رستوگی)، عالمی اقدار — امن و سلامتی کا راستہ (اے۔ کے بروہی)، علامہ اقبال اور نئی نسل (پروفیسر محمد منور)، اقبال بحیثیت شاعر و مفکر (اے۔ کے۔ انصاری)، نقشبندیہ اور مسلم قومیت کا نظریہ (ڈاکٹر فتح محمد ملک)، اقبال کی اپنی فارسی رباعیات کا انگریزی ترجمہ (ڈاکٹر محمد ریاض)، قرآن کریم کے مطابق اخلاقی فیصلوں کے علمیات (پروفیسر محمد رفیق چوہان)

اقبالیات

مشتملات: جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۲ (جولائی - ستمبر ۱۹۸۶ء)

شخصیات: ڈاکٹر رادھا کرشنن اور علامہ اقبالؒ (پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم) داغ کے اثرات اقبال پر (پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

فکریات: انفرادی تہذیب: اقبال کی نظر میں (ڈاکٹر مظفر حسن ملک) خودی (حکیم احمد شجاع پاشا مرحوم)

مطالعۂ خطوط: علامہ اقبالؒ خطوط کے آئینے میں (ڈاکٹر جمیل جالبی)

تحقیق و تدوین: اقبالؒ ایران کی درسی کتب میں (ڈاکٹر محمد ریاض) کلام اقبالؒ میں تذکرہ حیوانات (ڈاکٹر اکبر حسین قریشی)

تراجم: عقل و وجدان: اسلامی نقطۂ نظر سے باہمی تعلق (مصنف سید حسین نصر، ترجمہ: احمد جاوید)

رپورتاژ: اقبالؒ پر ایک یادگار عالمی اجتماع: حیدرآباد اجتماع (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

تبصرہ کتب: اقبالؒ یورپ میں (مصنف: ڈاکٹر سعید اختر درانی، مبصر ڈاکٹر صدیق شبلی) مطالب اقبال رح (مصنف: مقبول الور داؤدی، مبصر: تحسین فراقی) گلستانِ اعظم (مصنف: ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب، مترجم:

ڈاکٹر نور محمد خاں، ڈاکٹر کلثوم فاطمہ سید۔ مبصر: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی) اقبال کا تصورِ اجتہاد (مصنف: ڈاکٹر خالد مسعود، مبصر: محمد سہیل عمر) شاعری اور پارسائی: حکیم سنائی رح کے کلام کا مطالعہ (مصنف: جے۔ ٹی۔ پی ڈی برون، مبصر: محمد اطہر طاہر، مترجم: محمد سہیل عمر) مظلوم اقبال رح (مصنف: شیخ اعجاز احمد، مبصر: ڈاکٹر وحید عشرت)

اقبال ریویو

مشتملات: جلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۱ (اپریل۔ جون ۱۹۸۷ء)

رسول اللہ کی رحمدلی (مارٹن لنگس) اقبال کے فلسفہ میں خدا اور کائنات (رفعت حسن)، علوم فلسفہ میں مسلمانوں کا حصہ (محمد معروف) اقبال کا خدا اور گیتا کا دیوتا (LORD) (پورو سوتما بیلموریا) خودی (عطاالرحیم) دانتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم (شیر محمد سید)، اقبال کا نظریہ علم (خورشید انور)

اقبالیات

مشتملات: جلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۳ (جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۷ء)

فکریات: معقولات زمان و مکان کا اسلامی کونیاتی وجدان میں مقام (عبدالحمید کمالی) خطبات اقبال۔ چند بنیادی سوالات (محمد سہیل عمر)

تحقیق: کلام اقبال کے دو قدیم مخطوطے (ڈاکٹر گیان چند جین) قصہ ایک خط کا۔۔۔۔ (ڈاکٹر وحید عشرت)

ثقافت: اقبال کا نظریہ ثقافت (ملک محمد رمضان بلوچ)

تصورات: علامہ اقبال بحضور آدم۔ خلقی و فطری شرف (۲) (پروفیسر محمد منور)

تذکار: دارالاقبال بھوپال میں اقبال کا ورود مسعود (ممنون حسن خاں)

تبصرہ کتب: خدوخال اقبال پر ایک نظر (مصنف: محمد امین زبیری، مبصر: سید نظر زیدی)

••

Khuda Bakhsh Library
Acc. No 52224

The above approach obliterates the distinction between the basic creed and the social cultural moves of the environment in which Islam was born and developed. It is not realized by the advocates of religious totalism what a large portion of what they hold to be the 'Islamic way of life' is a legacy of the pre-Islamic Arab milieu. Now, if pre-Islamic Arab mores (not specifically repudiated by the Quran or the Prophet) could survive, why should not the same be done in the case of other ethnic groups and cultures ? In any case, the traditional culture, national character and historical situation of different recipient groups inevitably colour and shape the cultural or religious system acquired from others. All cultural systems—language, art, morality, religion—are subject to modifications in the process of diffusion. Cultural variations due to time and space are unavoidable. Equally unavoidable are protests against such modifications and innovations and the calls for a return to a golden past exemplified in a sacred personality or personalities. Such being the dialectic of history, ideological tension and conflict are inseparable from the human situation. Now religious totalism grea tly intensifies this conflict and leads to fragmentation of the human family on the basis of religion. Religion, so interpreted, becomes a divisive force. Religious liberalism, on the other hand, by readily accepting cultural pluralism and ceaseless growth, encourages the brotherhood of man, ever in the making, rather than of the brotherhood of the strict followers of a sharply defined creed. According to religious liberalism, all truth-seekers and sincere believers are brothers in faith speaking different 'languages .of the spirit.' All must be accorded equal respect and dignity, irrespective of the spiritual language they may happen to speak by virtue of the time and place of their birth.

14. If for instance, being a blue-blood Muslim implies (in addition to the five pillars of faith) bearing an Islamic name which is equated with a name belonging to"the Arabic or Persian language, wearing a particular dress, living in accordance with a partic lar life-style pertaining to eating, entertainments, segregation of women, accepting a definite economic system, and so on, those individuals or societies which do not satisfy the above requirements would stand automatically downgraded on the scale of 'true' Islam, Unfortunately, this line of thinking persists among numerous Muslims.

all too easy to substitute selective statistics and defensive rationalization for non-ideological factual analysis, in the name of Islamic research.

9. This is the problem posed by the glaring divorce between theory and practice, in this matter, in Muslim countries throughout history. Even more significant is the resort to 'juristic deception' *heela* in Muslim Theology enabling the believer to bypass the prohibition of usury. Two of the most common forms of 'juristic deception' are as follows : (a) the lender and the borrower agree on a deadline (pretty early) for returing the sum borrowed and also stipulate a fine or penalty to be paid by the debtor in case he fails to observe the deadline ; (b) the borrower sells some article to the lender at a nominal price and subsequently buys it back from the lender at a substantially higher price, thereby enabling the lender to earn a 'profit' without involving usury.

   It is noteworthy that Jews and Christians have engaged in precisely similar practices, down the ages, for the same reason.

10. The conservative view was that even if acceptance of interest on bank deposits differed from charging usury on loans, the banks, in their turn, did charge interest/usury on the sums lent out to others. Thus, the 'profit' they passed on to the depositor was eventually 'tainted money' rather than profit, in the proper sense, from trade or industry.

11. If the presence of risk be the real criterion for justification of unearned profit by a sleeping partner, while the absence of risk for the non-justification of interest, the concept of profit distribution by Islamic banks to depositors might become questionable since hardly any risk is involved in such transactions.

12. The prohibition of interest, the institution of *zakat*, the Islamic law of inheritance, severally or jointly, would not suffice, by themselves, to solve our complex problems. The prohibition of interest will not do when acute distress, urgent need of capital, or national defence, etc, make borrowing on interest unavoidable. *Zakat* will not do when savings are almost zero and the consumption and development needs of the society large. The law of inheritance will not do when all there is to inherit be poverty and disease.

   Moral exhortations whether in the name of religion or of a secular ideology will also not do if situational factors and constraints have been ignored in the framing of the ideal or in legislation. Thus, even the nationalisation of the means of production will not do when productivity fails to catch up with social needs. No economic system or philosophy will succeed if it entertains a romantic illusion concerning human nature.

13. Religious totalism, in its extreme forms, includes even such matters as language, food, dress, games, entertainments, social customs and etiquette in the purview of religion. Thus, the true Muslim is expected to conform to the Islamic ideal or norm in all the above matters.

4. Islamic economists differ among themselves with regard to issues such as nationalization of land and of the means of production. While some, like Ghulam Ahmad Parvez, and others, are inclined towards Islamic Socialism, others like Maududi, Baqir Al-Sadr, are inclined towards a different position. Generally speaking, however, Islamic economists proclaim the necessity for adopting an independent Islamic economic order which, however, has yet to be evolved and tested. See Nijatullah Siddiqi : Survey of Muslim Economic Thinking, Islamic Foundation, Leicester (UK), 1980, pp. 46-53.

5. To accept or reject, in the name of the Quran, the theories of Darwin, Copernicus and others involves the fallacy of projective interpretation. 'Field-integration' on the other hand, is based upon the principle of creative fidelity and inner consistency in the continual reunderstanding of Scripture, and does not commit any fallacy of projection in the pejorative sense. Re-understanding of Scripture is indispensable for grasping the directive significance of the revealed text in an ever changing human situat

   All understanding or interpretation of any language, culture or religion takes place in an antecedent framework of concepts, values, interests, attitudes of the individual. Differences in the above lead to different perceptions and formulations of theory. The first and foremost task of philosophy is to make one aware of the basic sources of such disagreement rather than the defensive justification of any particular perception or formulation. A mature and balanced philosopher is not precluded from making a final choice of theory or formulation, but he must not cherish the delusion of its demonstrable truth, to the exclusion of all other theories or conceptual formulations.

6. Many Muslim social scientists are today engaged in an ideological attack upon the evils of interest-based economy (just as others are engaged in an ideological demolition of some other economic doctrine) rather than a neutral analysis of the several aspects and ramifications of the issue of interest. To give an instance, Nijatullah Siddiqi claims to have written his learned paper entitled, Rationale of Islamic Banking, published by the International Centre for Research in Islamic Economics, Jeddah, 1981, as a social scientist rather than as an apologist for Islam. Yet, the learned author does not concede any element of value, whatsoever, to interest as an economic tool.

7. Edmund Husserl (d. 1938), German philosopher, and one of the founders of Phenomenological Existentialism, first elaborated this concept. No knowledge is possible without first suspending one's antecedent beliefs and adopting the inner posture of 'epistemic openness, without evading or explaining away any possible or actual conflict between antecedent belief and the findings of honest and accurate analysis.

8. All doctrinaire approaches lead to this fallacy. Perhaps, no other doctrinaire oversimplification has caused as much harm, on a global scale, as the early Communist over-simplification of the issue of population planning and the charge that the slogan of over-population was a false Capitalist alarm. I respectfully submit, it is

Luther, (d 1546) who forcefully pleaded that while usury was morally repugnant, interest on commercial and developmental loans served social needs.

The above approach found ready acceptance in Britain—the first industrialised country in the modern sense and also the country where the seminal work, the Wealth of Nations, published in 1776, by the philosopher, Adam Smith (d. 1790,gave birth to Economics as a social science. Significant contributions by Jeremy Bentham (d. 1832), J. S. Mill (d. 1873), Ricardo (d. 1823) Malthus (d. 1834) and others followed to enrich Economics as a pure social science.

The growth of theoretical Economics and the practical constraints of rapid industrialisation fostered a new outlook on social and religious problems. The legal prohibition against usury was repealed. Soon afterwards, the statutory ceiling on the rate of interest, and the legal penalty for violating the maximum limit, was removed in the early 19th century in Britain and elsewhere under the influence of the philosophy of *laissez faire* liberalism.

The middle of the 19th century, however, saw a reaction against the doctrine of absolutely free and uncontrolled market economy. Several sensitive minds began to think that the much-lauded free market economy had bred numerous social and economic evils—uncontrolled ubranization,poor-house poverty, crime, rootlessness, anonymity, alienation, dehumanization of labour, unemployment, all flourishing in the midst of and despite mass production and affluence. The ideas of cooperative production, state regulation, and finally, of socialism came to the fore in order to remove the grave imbalances created by the free interplay of market forces. There was a spate of social welfare legislation and economic regulations in western countries to protect the weaker sections. Institutional arrangements were made for the supply of cheap credit to the needy and for protecting insolvents. Thus, while the religious prohibition against usury was done away with, its basic objective—the protection of the interests of the weak was sought to be promoted by means of democratic and socialist ideals. Liberal Christian thought contributed to this development but conservative, rather static, quarters within the Church were reduced to the position of preplexed and helpless spectators of the new emerging values.

To complete the picture, a few remarks may be made concerning the ancient Indian approach to usury. The *Dharmashastras* also strongly disapprove of usury on distress-loans. Indeed, one *Dharmashastra* declares that usury, *kuseed*, in the case of a distress-loan, is a greater evil than even the murder of a Brahman, *Brahmhatya*. However, commercial interest is permitted. Different law-givers prescribe different rates of interest bearing in mind different relevant factors and also safeguarding the legitimate interests of the creditor and the debtor and also of the society in general. However, it must be pointed out that there was caste discrimination while fixing the varying rates of interest (the rate being lowest for the Brahman borrower). Moreover, the general rate of interest was much higher than the rate of modern times. The lowest imaginable rate for Brahmans being 15% per annum. Buddhism follows the Hindu practice but without any caste bias.

NOTES AND REFERENCES

1. Perhaps this is partly why the contemporary talk of Islamizing the economic system in Muslim countries attracts many educated Muslims in their endeavour to prepare a complete blue-print of the true Islamic way of life. The Muslim liberals of the late 19th century, Sir Syed, Chiragh Ali, Amir Ali, Muhammad Abduh et al. on the other hand, had not only ignored the widespread practice of Muslims borrowing money, on interest, from money lenders (both Muslim and non-Muslim) but made a theoretical distinction between exploitative usury and commercial interest. The liberals held that the Quranic prohibition referred to usury, in the ancient and medieval sense, and not to interest for commercial purposes. The government of Ottomon Turkey had even legally provided for the maximum rate of interest.

2. Though the Quranic command to cut off the hands of the thief is categorical, the traditional Islamic canon law admits of several well known exceptions. Thus, the penalty stands routinely waived when the thief and his victim are close blood relations, or when the amount stolen is below a prescribed minimum, or in the case of catables, musical instruments and so on. Yet another example of a flexible interpretation of the Quranic prohibition of intoxicants is the permissibility (according to Abu Hanifa, who commands the largest following among the Muslims) of date-wine of a particular type *nabeez*.

3. Usury on distress-loans has been universally disapproved and morally condemned because it implies turning the suffering of a fellow human into an opportunity for material profit. In ancient Babylonia, Hammurabi (app. 2000 B.C) sought to regulate the rate of usury. A new king often declared the cancellation of all debts at the time of his coronation.

   Judaism prohibited usury in the strongest possible terms making no distinction between distress-loans and loans for any other purpose, but permitted Jews to charge usury from non-Jews. The Christian canon law made the prohibition universal. In the middle ages Thomas Aquinas (d. 1274), the greatest medieval Christian theologian, made a distinction between distress and commercial loans, but the canon law was not altered. In practice, however, the prohibition was conspicuous by its violation due to economic compulsions.

   The religious leaders of the mercantile Italian city-states of the early modern era, Florence, Venice and others (which were the pioneers of modern international commerce and banking) were the first to question the ethical and religious validity of the absolute Christian prohibition of interest without distinguishing it from usury when commercial practice had already sharply deviated from canon law. It was, however, John Calvin (d. 1564), the great Swiss Protestant reformer, no less influential than his more internationally famous German contemporary, Martin

too subtle for easy detection—a sense of gradation within the community of believers, assuming they have not been declared outside the pale of Islam.'[4] Shall not the self-appointed judges on the quality of Islamic faith of others fall victims to spiritual pride, whether the judges belong to the dominant majority or to the peripheral sects, sub-sects or microscopic cults? Therefore, I respectfully submit that no classical definition, nor any attempted redefinition of Islam, be treated as final in a situation where the heresies of yesterday grow into the dogmas of today.

In retrospect, the liberal aproach of the nineteenth century Muslim reformers and statesmen which was in harmony with the broad evolutionary direction of world history towards separating religion and politics, should not be equated with separating morality and politics.

The separation of religion and politics does not mean the separation of morality and politics. While the former disjunction is pre-eminently desireable, the latter has been the recrurring tragedy of man's story from the very beginning. The de-linking of morality and politics produces power-hungry politicians or wielders of power, while their union truly great statesmen. But the chief limitation of the Islamic liberals was that they did not, or rather could not, create a conceptual framework to ensure an orthogenetic evolution of Islamic concepts and values. The Muslim liberal mind was not yet ready to undertake a task of such gigantic magnitude,—a task which has continued presenting a challenge to the religious creativity of Western man ever since the Reformation five centuries ago.

Though the 20th century is drawing to a close, I do not find any mature intellectual and spiritual re-awakening among the Muslims apart from the quest for political and economic power. However, I feel optimistic about good results in the next century from the honest creative efforts of truth-seeking Muslims (specially in democratic and secular India) provided, of course, they combine clear thinking and moral courage to speak out the truth as one sees it.

task. Instead of working for bringing about field-integration between the different dimensions of man's growing experience and insight, the votaries of Islamization address themselves to the task (in itself desirable but totally insufficient) of orthogenetic modification in the *shariat* as a total code of conduct. The way out of the malaise of the Muslim, is nothing less than an insightful redefinition of the nature and function of religion including Islam as such.

In more concrete terms, the solution is to confine the function of religion to the realm of transcendental mystery, and of 'faith in the unseen' with which, however, the believer relates himself through symbolic language having the power to grip well-informed, autonomous minds, while individuals and groups feel free to work out, through the democratic process, rules and regulations of the good life, reflecting the core of the Islamic creed and its value system. The liberation of the Muslim mind from the hold of the unquestioned assumption in regard to the nature and function of religion is the condition of their worldly as well as spiritual advancement. This applies not only to Muslims of mixed secular societies but to Muslims as a whole.

Far from debilitating or destroying Islam, such a liberation would cure an almost all-pervading self-alienation and sordid hypocrisy, and revitalize the Muslims spiritually and intellectually. There is no other way to overcome the chasm between Islam, as an ideal, and the state of Muslims in history—a chasm so frequently lamented upon but rarely conceptually analysed and understood by numerous sincere but conceptually innocent believers in liberalism.

Islam implies (and the implication is crucially important) that Islam must be conceived in plural terms. No particular model of Islam should claim or be given a privileged status of being the norm or standard for judging other professing Muslims who may profess a different model out of inner conviction or whose life-situation may not permit any particular model because of external constraints. An absolutist approach to inter-religious as well as intra-religious dissent leads to intolerance. This evil is easily detected and now rightly condemned. But the absolutist approach leads to an evil

The movement of Islamic Resurgence is an attempt to overcome the inertia and stagnation of the Islamic world for the past several centuries as was also the aim of the liberal reformers of the last century. The later in time is, however, not necessarily or always the more mature or valid.

While the Islamic vision of the liberal Muslim reformers and statesmen was blurred and dim on several counts, it had one outstanding merit which is conspicuous by its absence in the contemporary Islamic movement. And that merit was the realization (a) that the essential nature and function of religion in an ever changing human situation was inspirational rather than legalistic, and (b) that there was a distinction between the Islamic core, as a transcendental creed and value system, and Islam as a cultural *gestalt* moving in social space-time. The contemporary movement, on the other hand, merely distinguishes between the core and the details of the *shariat* and risks to 'adjust' it to meet contemporary needs more effectively, thereby displeasing conservative Muslim opinion. But the contemporary movement is unable to extend the distinction between the core and the periphery, the essential and the contingent, the eternal and the temporary, to the crucial issue of the function of religion from the historical as well as the ideal points of view. Consequently, the contemporary movement accepts, as a self evident truth, the medieval theory of religion as a total conduct of life. From this point of view, they cannot but conclude that the post-eighteenth century liberal Christian tradition in Western Europe and America is nothing but a corrupt and degenerate phase of Christianity. The only lesson such a view could possibly have for Muslims and other religious believers is that they must stick with all their might to the medieval theory of religion as a total code, (as much applicable to the political economic and cultural spheres of life as to the purely spiritual) if they wish their religion to be spared the catastrophe which overlook Western Christianity in the late eighteenth century. In other words, the contemporary movement seeks to go back upon and undo the considerable work that was done by the liberal Muslims of the previous century, instead of taking up the torch of the great Islamic liberals and going forward with their unfinished

the corridors of power, different standard-bearers of more or less similar values, trample upon those dreams (with pangs of conscience, perhaps, in the beginning, and with, none as power blunts their conscience) in a mad race to reach or to retain their quintessence or their values-power.

It is the above fatal flaw of man, rather than flaws in the different thought and value systems, which is the source of the shattering of man's dreams. We register, even magnify and censure, the lapses of others in their pursuit of power ; the lapses of our own are hardly noticed, or when noticed hardly bother our conscience. But the tragedy goes deeper Even the common man finds it almost impossible to withstand the seemingly irresistable economic pressures and situational constraints that push him in a direction different from the moral and spiritual values he professes with a fair degree of subjective honesty and sincerity. The few exceptions to this rather tragic situation only go to prove the rule

In the final analysis, therefore the fault lies in the human clay rather than exclusively in any particular system And, while we can modify or even replace systems, we cannot alter the human clay much as we may educate or 'condition' the human brain and heart. Wisdom lies in continually improving the system in the light of actual experience rather than of priori formulae (religious or secular) and striving to purify the clay without expecting miracles of success and without losing the heart to march along, despite falls and failures, on the endless road to Utopia.

The basic approach of contemporary Islamic Resurgence may be called 'religious totalism' to distinguish it from the 'religious liberalism' of the late nineteenth and mid-twentieth century. 'Religious totalism', affirms that life is an organic unity of the spiritual and worldly concerns of man and religion must regulate this totality.[38] 'Religious liberalism', on the other hand, affirms that the essential concern of religion is with the transcendental or spiritual dimension of human life.

It may be thought that the values of Islam are so uniquely distinctive that no extra-Islamic search for integral human welfare could ever satisfy the aspirations and ideals of a true Muslim economist. Consequently, he might say, the concept of Islamic economics, as theoretical discipline, is unavoidable for the believer. This approach does not appear to be convincing. Let us examine why.

The basic spiritual and moral values of all universal religions as also secular thought and value systems are essentially similar even when they differ in their theological beliefs, legal systems, practices, customs regulating dress, food, marriage and funeral rites etc. Such differences, however, do not negate their basic agreements which suffice for peaceful coexistence and a sense of harmony. In fact whenever a genuine meeting of minds and hearts takes place between diverse groups, there occurs a process of mutual interaction and learning. Does not this go to show the potential unity of basic values underlying the plural metaphysical beliefs, myths, symbols, rites and rituals of the human family.

The fact of the matter is that liberal humanists, Utopians scientific socialists and Gandhian reformers, no less than Islamic economists, stand for the same values in the long run (despite, obviously, differing on details and on the best means for reaching the values concerned). To suppose that the Marxists or the liberals are oblivious to higher values and that filling the belly is their only aim and objective is to distort the true picture. Thinkers, reformers, teachers, poets and artists of the human family as a whole, have the same dreams and aspirations. However, it is not they, but rather the wielders of power–political and economic–who run the societal machine and pilot the ship of state with scant concern for the dreams and aspirations of noble hearts and enlightened minds yearning to be heard by the powers that be. But alas ! the dreams remain mainly embedded in sacred hearts, though they do cause a flutter in society and make the ship of state slightly change course when the weather becomes too rough to be completely ignored. Even the radical change sometimes brought about by socio-cultural revolutions or break-throughs of history has barely touched the depths of social reality, with a few notable exceptions. Meanwhile

The Islamic economic axioms or fixed coordinates of the economic system are only two : (a) the prohibition of usury and (b) the wealth tax (*zakat*). Now the prohibition of usury has a universal validity, provided the prohibition be interpreted as a total ban on exploiting of human distress for material gain, and not as an indiscriminate and absolute restriction on using interest as an economic tool for mass or micro purposes.

The injunction of *zakat*, again, has a universal validity, if the injunction be interpreted as a recognition of the inalienable duty and responsibility of the state towards the betterment of the weaker sections of society rather than as a fixed and all-sufficient obligatory charity at 2½% of the surplus wealth. In other words, an open interpretation of the Quranic economic axioms in the light of a dynamic approach to Islamic ideal of social justice, might conceivably lead to results which are essentially similar to the results of 'economic rationality' whose aim is not merely maximum economic gain for any particular individual group or even for society as a whole, but which aims at the integral welfare of Society.

Islamic economists appear to assume that economics, as a pure social science, possibly cannot have any concern for values other than maximal growth of material wealth On this assumption Islamic economists understandably try to supplement this lop-sided objective/or concern of pure economic theory with the concern for human welfare as interpreted in Islam. But, as matters stand at present, all contemporary social thought links the idea of 'economic rationality' with the ideal of integral human welfare. Thus their objective is never mere wealth but welfare including material prosperity as one of its ingredients or dimensions. Economists, in their capacity as pure social scientists, may well engage themselves in spelling out the implications or demands of economic rationality (in the restricted sense) under perfect economic conditions. But such conceptual projections and exercises are motivated by scientific curiosity as in the case of logic, mathematics or pure science and do not claim to displace the imperative of social welfare as interpreted by the collective conscience of humanity. If so, hardly any need is left for juxtaposing Islamic Economics *vis-a-vis* the general economics of welfare.

Epiloque

Socio-economic evils do not spring from the vicious root of interest but rather from a combination of economic deprivation, negative or destructive human drives and an unplanned society which is unable to develop the human potential for intelligence, honesty, self-discipline, fraternity and love. These values are upheld by Islam but they are not the monopoly of Islam or any other particular religion or culture

All basic moral and spiritual values operate in an ever changing human situation, and must, therefore, continually be reinterpreted or revised. A perennial aspiration for the better, continuous research, and social and state action should bring about ceaseless growth in our cherished values. Here vociferous slogans for Islamization are no substitute for their genuine growth. The contemporary climate of Islamic politics tends to dissipate the rational and empirical approach to complex problems, ignoring social evils far more serious than the evils flowing from the violation of some well known features of the Muslim canon, law or *shariat*.

Islamic intellectuals and leaders of political opinion must realize the plain truth that the economic directives of the Quran or the economic system of the golden age of the pious *Khalifas* will not suffice in the modern age.[13] There is no alternative but to follow where the argument of Economics, as a social science, leads us. This implies conceptual analysis, the construction of different models of economic correlations and sequences and formulation of tentative hypotheses or theoretical choices to be finally accepted or rejected in the light of empirical verification. 'Islamic Economics' in the pure theoretical sense is not a valid concept The concept of an 'Islamic economic system', in the normative sense, is nothing but sophistry and illusion. However, it is a proper and vitally significant question to ask : Are the Islamic economic axioms valid, and can they serve as the fixed coordinates of a developed economic system for the modern age ? Well, the axioms are valid, provided they be interpreted flexible in the light of 'economic rationality' and they can yield a system (which could be termed 'Islamic', if it so pleases Muslims) suitable for modern industrial society. Let me explain this crucial point.

It appears that Islamic economists who point out the moral, economic and social harm flowing from interest just never mention any of its positive advantages or functions. Or is it the case that there is no positive side at all to interest ? This is certainly not the case Indeed, most economists are of the view that interest performs an irreplaceable socio-economic function and that all efforts toeliminate interest from Society are futile.

It is significant that socialist thinkers and reformers as Robert Owen (d 1858) of Britain. Rodbertus (d. 1875) of Germany, had condemned interest and advocated its abolition. Marx and Lenin did not hold interest to be the arch evil. Though the Soviet Union had excluded interest, as a cost factor, in the early period just after the Russian Revolution, this practice has been given up. Thus, even Socialist planners who reject the Capitalist system, nevertheless, include interest for computing the total cost of production and for fixing the consumer price despite the state being the sole producer and distributor without any internal competition or market economy.

It appears to me, as a layman, that the failure to eliminate interest at the micro-level in England, France and Germany, and the more recent failure to exclude interest at the macro-level in Soviet Russia as cost factor of production is a significant pointer to the probable necessity of interest, at least, at macro-levels. This, conclusion, however, does not adversely affect the possibility as also desirability of abolishing interest or rather usury in the case of distress loans and also in the case of some specified consumption loans for educational or cultural purposes.

Interest is an economic tool performing several functions only some of which could be taken up by the scheme of profit and loss sharing. Social scientists, almost without exception have concluded after prolonged enquiry that there is no effective substitute for interest just as an overwhelming majority of well informed and independent social philosophers and enlightened statesmen have arrived at the conclusion that despite the evils of democracy no better substitute is available. It is another matter that enlightened despotism may work wonders in the short run.

In short, the morality of interest cannot be settled through an immediate and simple value judgment as in the case of such evils as murder, rape, falsely incriminating an innocent person and the like. The abhorrence with which many Muslims look upon interest (which they judge as the root socio-economic evil) is probably the result of extending their understandable moral repulsion against usury (interest on distress loans) to all types of loans and to all contexts in which interest is charged. But a balanced evaluation of the issue of interest requires committed Muslim, no less than others, to discriminate between usury and interest in the different contexts and functions of interest instead of passing a blanket judgment.

Modern industrial/commercial interest, in the final analysis, is a considerable thin slice carved out of the calculated or expected profit, and its function is to ensure a stable and risk-free but low return to the lender who prefers the stability of return to the possibility of higher profits associated with a partnership. The concept of interest implies mutual concessions and accomodation between the lender and the producer. Far from being an instrument for exploiting the industrialist or the worker, it serves to maintain the balance and smooth running of the industrial/commercial machinery. It is a guaranteed thin slice out of anticipated profits on a bigger scale, and there seems to be nothing morally wrong in the concept of a guaranteed return on a loan or investment provided the guarantee gives a reasonable 'cushion' for the borrower in cases of failure, partial or total.

Interest, it will be seen, adds up to the total cost of productions and thus certainly adds to the price of goods and the rigours of the producer. But then interest protects the legitimate interests of the lender and promotes a proper climate for industrial lending and the circulation of money. Again, while adding to the cost of production, interest promotes a ceaseless concern for reducing production costs in a highly competitive market economy.

We should thus keep in mind the advantages as well as disadvantages of interest as of any other social practice or law in order to arrive at a balanced perspective.

together create the base for the subsequent productive role of labour and management. Once the organism is born and the infant plant becomes an adult organism, the role of the management and the workers also acquire a key role in raising the productivity and quality of the enterprise. But at the initial stages the capitalist and the entrepreneur play the crucial role of conceiving and producing a new social organism as such.

If all the different factors of production were to be supplied by one individual, he could rightly claim to appropriate the entire profit. This is not possible when large investments are made. The need for capital is fulfilled through various mechanisms or modalities : the accumulation of share capital, borrowing on interest from an individual or a bank or the state or some corporation, or by entering into a partnership with a person who can spare his idle money but not his time and energy. Now is there really any conceptual/or ethical difference between the above modalties or situations ?

Are not all the above situations characterized by a common feature—a claim for monetary return on the strength of the monetary contribution towards turning a mere idea or paper project into a productive concern ? And how can this claim judged to be morally repugnant in some cases but right in others ?

It is true that the projects of the sleeping partner are risk-bearing, while the interest (fixed charge of the bank/capitalist) is risk-free. But how does this economic difference amount to any moral difference between 'strictly' unearned profit and interest, rendering the profit of a sleeping partner moral and the fixed charge of the bank/capitalist immoral ? It may be said that the concept of a fixed charge bears an inherent or inbuilt moral evil since the absolute claim of the bank/capitalist to interest, —irrespective of the economic health of the venture and even when the venture is heading toward failure—implies or results in callous avarice on the part of the lender and inequitable exploitation of the borrower. But then this extreme situation is not the normal pattern of the economic process. Moreover equity demands the protection of the legitimate interest not of the borrower alone but of the lender as well.

One conception of interest is that it is the price a borrower is required to pay for satisfying a need he is unable to satisfy from out of his own available money. The excess payment he makes to the lender, over and above the principal amount, is the price of the borrowed money. Another conception is that the excess is the rent for the use of money belonging to the lender. Yet a third conception is that interest is the claim of the lender to be compensated for depriving himself of the actual or possible enjoyment of his own wealth which he places at the borrower's disposal.

In the context of trade and industry, interest is a relatively small fixed charge upon the theoretically larger profit of enterprise. It may be viewed as guaranteed unearned profit whose justification is that the supplier or capital—one of the necessary conditions of enterprise—is entitled to a small but assured return, independent of profit/loss, in return for placing his wealth at the disposal of the producer who is left free to direct the enterprise and who aspires to a relatively much larger return by way of profits.

The other factors of production (apart from capital) are land, technical skill or know-how, management, labour, and last but not least, entrepreneural leadership and organizational capacity. Now each factor of production is severally and jointly essential for the success of the enterprise and each has a rightful claim for just consideration. But entrepreneural leadership and the supply of capital do occupy a unique position or status in the sense that they jointly create the productive space or soil for the inception and future growth of the enterprise. Without such space or a base having been antecendently provided by the capitalist and the captain of industry, the social organism, comprising management and labour, would not have come into being at all. It is, therefore, understandable that the capitalist and the industrialist as founders and directors of the enterprise claim a higher status and appropriate the profits of the enterprise, while the management and labour receive fixed salaries for specified jobs. As between the capitalist and the industrialist, if the former supplies money-capital, the entrepreneur supplies the creative idea, dynamism and organizational initiative—the ideational/volitional capital. The two

problem, since all transactions would involve interest. Since economic isolationism is practically not possible, interest bearing transactions per force would have to be continued thereby creating anomalies and complications at different levels.

Thus there does not appear to be any justification for permitting unearned profit but prohibiting interest'[1]. Consequently, scheme of profit/loss participation by Islamic banks in place of interest-bearing loans to the entrepreneurs is rather a change in nomenclature—substituting the theologically acceptable term 'profit' in place of the theologically repugnant term 'interest' without any really meaningful change in the sphere of industrial or commercial transactions. However, the scheme of advancing interest-free distress loans or consumption loans for specified purposes *qarz-e-hasana* is a meaningful and welcome reform in the sphere of banking.

Modern economists have defined interest in various ways putting forward several theories of interest. These theories are, at bottom, attempts to assimilate or reduce interest to some other concept as profit, rent, price, cost, increment, reward and so on. As a student of philosophy it appears to me, that no theory which is purely reductive could ever provide a complete analysis of the nature and function of interest in every possible context. It seems that, in the context of industry, interest approximetes a factor of the cost of production; in the context of consumption loans, interest approximates price or rent of the borrowed money ; in the context of state bonds, interest approximates reward for waiting ; in the context of distress loans, interest approximates extortion. No single conception of the 'essence' of interest would thus suffice in all cases. Likewise, no ethical or economic appraisal of interest, in a blanket manner, would be valid. To arrive at a proper evaluation one must take into account the context and the exact function of interest in the type of situation under review. The concept of 'increment' which interest logically implies is, ethically, an indeterminate concept. We shall now briefly review some of the different conceptions of interest without attempting any reductive definition.

the concept of a fixed charge upon productive capital independent of the profit/loss incurred by the producer.

(c) Let us now examine the assumption that the abolition of interest would not bring down productive investment and the growth of the economy in general since profit/loss sharing by individual sleeping partners or by banks would do the same job presently being done by the mechanism of interest.

The above assumption is not really warranted by our present state of knowledge and experience. Confirmation of this abstract economic analysis requires empirical verification which is a far cry at present. But whatever may be the final verdict of experience, careful non-ideological analysis does not warrant the optimism of Islamic economists in this regard. The reason is as follows: A sleeping partnership involves full liability without power or the security for the sleeping partner who parts with his capital merely on the basis of active hope in the honest dealings by the managing partner. This, indeed, is the Islamic ideal (as also the ideal of other human religions an human decency in general), but the distance between the ideal and the real is notorious. In case the partner be tempted for some reason or other to cheat or indulge in some sharp practice at the expense of the sleeping partner (such instances being too common in the human family to be ignored by the mature and balanced law-giver) the sleeping partner will ever remain at the mercy of the partner. It is precisely at this point that the economic function of interest appears in a sharp focus. No other economic mechanism appears to serve the same purpose as effectively as does interest.

The possibilities of the active partner misusing the funds of a sleeping partnership would be reduced if Islamic banks exercise proper vigilance both before and after investment. In any case human nature, being what it is, the degree of security of investment, per force would depend upon the accuracy of the producer's balance sheet. Moreover, auditing work would multiply enormously creating scope for concealment and corruption.

International trade, which is unavoidable in view of the interdependence of the human family as a whole, would pose a further

that interest involves a moral evil, while profit/loss sharing does not. There is an element of truth in this contention. But this moral factor becomes relevant only when the producer is close to or actually reaches the state of economic break-down or the rate of interest be so exorbitantly high as to make the profit almost nominal. Otherwise the presence or absence of risk, or the fixity of interest and flexibility of profit/loss makes no ethical difference. In general, claiming a share in unearned variable profits on the basis of supplying capital to a partner is as moral or immoral as claiming interest, as a small but fixed charge, irrespective of profit/loss together with foregoing any share in profit/loss.

Another aspect of the matter deserves as much consideration as the avoidance of undue hardship to the producer when facing rough economic weather—producing the legitimate interests of the lender or sleeping partner. It appears that interest (viewed as a fixed charge paid by the producer) tends to motivate him to keep costs down and earn enough to be able to pay the cost of borrowing the capital, while cost-free capital tends to make the economic cushion much too soft for the entrepreneur and to slow down the rate of growth of the economy. Moreover, keeping the rate of interest on the lower side, implies that the creditor pays a definite price for eliminating the factor of risk and being content with a considerably reduced share in the net profit that would have accrued to him in as a sleeping partner. Choosing a lower share for the sake of security and the elimination of risk does not involve any moral wrong. It is exercising caution and demanding a measure of a security on the strength of the lender's financial contribution to the productive venture. This justified caution might become immoral avarice leading to exploitation of a fellow human being in distress. Only in extreme cases and in such situations the law of liquidation and solvency attempts to do justice to the creditor and debtor alike taking into account all the relevant aspects of a complex matter. If justice requires not merely the protection of the interests of the producer or trader but nominating the economic growth and balance of a complex modern society, the general rule rather than extreme cases ought to be taken into account for making laws or regulations. In the light of this principle no inequity is involved in

insurance, holding that while the function of gambling (namely momentary thrill, excitement or natural gain without giving anything in return to society) is undesirable, the function of insurance (namely protection against unhappy contingencies) is pre-eminently desirable. Now why should not this method of interpretation also be applied to the different types of loans and the issue of interest? Is it not the case that while the charging of interest on a distress loan involves exploiting human misery, this is certainly not true in the case of loan for development of industry or commerce. Again, is not ancient and medieval usury involving penal bonded labour in case of the failure of the debtor to honour his commitment very different, in the functional sense, from interest used as a tool for stimulating the economy and protecting the legitimate interests of the investor, the entrepreneur and society in general?

Analytical discrimination and juristic reflection have, indeed always been practised by Muslim jurists no less than the Prophet and the pious Caliphs. The classical distinction between developed and virgin land, and permitting farming or share-cropping in the case of the former but prohibiting it in the case of the latter is a good example. The same remarks apply to the penalty for theft and many other matters. The point is why should not the same approach be followed in the case of the issue of interest.

(b) We now come to the second assumption—unearned profit which is risk-bearing is equitable, but unearned interest which is devoid of risk is inequitable.

Is there really any moral distinction between the risk-bearing nature of profit and the risk-free nature of interest over and above the purely economic difference that while profit is contingent and flexible interest is pre-determined and fixed?

Now it may be thought that interest being an absolute claim of the investor or lender, irrespective of the economic health of the productive enterprize, might cause unmerited hardship to the producer if and when things go badly with his enterprize for no fault of his own. This unmerited suffering is not associated in the case of profit-loss sharing. On this score it might be contended

rates of usury modelled on the rate of biological reproduction or growth. The biological model was quite understandable in an age when theoretical economics, social science and militant class consciousness were non-existent and the rising merchant or trader had to borrow money in what may be termed as a "usurer's market". The general rate of usury for traders and manufacturers was thus pushed up and no exception was made in the case of distress or consumption loans, whose purpose was obviously quite other than increasing his wealth. This state of affairs led to avarice on the part of the already rich and to the exploitation of the poor or the needy whose lot became even worse when they had to undergo bonded labour as a penalty.

Interest in the modern sense is computed as a function of the generally viable rate of profit in a given society. This approach has pushed down interest rates in the modern age though in some situations the state may try to push the bank rate upwards in order to put a brake upon reckless borrowing or wasteful and ill-conceived investments. Furthermore, the law prohibits penal bonded labour if the debtor genuinely be unable to discharge his commitments. Interest in the modern sense is thus quite different from usury. The assumption of their structural and functional identity breaks down in the light of historical and analytical scrutiny.

The modern practice of 'insurance' and the debate among Islamic economists whether insurance involves gambling (which is prohibited) is very relevant for correctly interpreting the Quranic prohibition of *riba*.

Insurance which was not known in early times finds no mention in Islamic jurisprudence, while gambling and games of chance are prohibited. Now since insurance definitely involves the operation of chance, the principle of analogical reasoning *qiyas* led most jurists to conclude that Islam also prohibits insurance. It is only some Muslim social scientists or modern-minded jusists who think on different lines. Let us see what method of interpretation do they adopt when they permit insurance even though it does involve the operation of chance. In the final analysis they make (rightly) a distinction between the function of gambling and the function of

To my mind, most Islamic economists start the exercise of Islamizing the economic system in Pakistan and elsewhere on the basis of three unchecked assumptions which are very far from being self-evident to a dispassionate analyst. The assumptions are: (a) there is no difference between usury and interest so that the Quranic prohibition of usury implies the prohibition of interest; (b) the unearned income or gain from a 'sleeping partnership' is morally right, while unearned gain in the form of interest is morally wrong because of risk being present in the first case and absent in the second; and (c) the abolition of interest would not adversely affect economic activity and growth in general but rather purge it of social evils. Let us now examine the above assumptions in some detail.

(a) Usury, in the ancient and medieval periods, was a charge upon all types of loans including distress loans contracted even by the poorest and weakest sections of society. Avaricious money lenders did not even reduce usury rates in case of distress loans to say nothing of waiving the interest out of sympathy or compassion. In this regard there is no difference between usury and interest, in the modern sense. Yet, it would be quite fallacious to equate the two for the following reason. The rate of usury was fixed on the model of biological reproduction or agricultural growth which follow geometrical proportions, while interest, in the modern sense, is calculated on the basis of arithmetical proportion. The difference between the two models of growth is so enormous that to equate usury with interest becomes like equating the domestic cat with the tiger. The model of biological growth was suggested (quite naturally and understandably) by the average rate of growth in the case of domesticated animals and also of familiar agricultural crops. Their general growth rate comes to approximately 400% per annum, while modern interest rates are deliberately kept, relatively speaking, very low. The reason for this almost startling discrepancy between the rates of usury and of modern interest is that the ancients did not adequately grasp the role of planning and skill of the trader without which the capital borrowed by him would not have grown at all. In other words, the owner of wealth tended to over, value his own role at the expense of the merchant or industrialist, and this scale of valuation was reflected in the high

Society abolishes interest ? Again, how or in what precise way is an interest-free society more desirable than an interest-based society ? The answer to these important questions shonld not be given by way of justifying the Quran or the *Sunnat* but must be based on honest and searching reflection in the light of reliable factual investigation.

The liberal Muslim intellectuals and statesmen of the previous century, among whom S. Khuda Bakhsh occupies an honoured place, did, indeed, attempt this important task. They made a distinction between (a) usury and interest and (b) different types of loans—distress loans, consumption loans and development loans for various purposes. They came to the conclusion that accepting bank interest on deposits and commercial interest were quite permissible.[19] However, charging interest on distress loans or even on consumption loans was un-Islamic.

Accepting bank interest on deposits is very different from charging interest on loans advanced to others. The depositor places his savings at the disposal of the bank which invests them either in the form of loans or purchase of shares in sound industrial concerns etc. The interest given by the bank is, in reality, a slice of the profits which accrue to them on their investments.

Interest-bearing deposits in banks or companies thus promote investment of idle money for the dual purpose of increasing the owner's wealth without diverting him from his actual vocation as also promoting general material prosperity through increased production and employment of the work force.

The Muslim liberals were correct in their basic approach, but their historical and analytical discussion of the nature and function of interest was too inadequate to convince traditional conservative opinion on such matters. They were unable to provide a rationale satisfactory to both reason and Islamic faith. Perhaps this explains how and why the economic content of the contemporary movement of Islamic Resurgence has gained considerable vogue in several Muslim countries. To this theme we now turn.

the highest grade of human ontic excellence. And this authenticity is attainable in theory, both by the autonomous philosopher or seeker of truth, and by the man of faith in the condition of 'blessedness' in the classical spiritual sense. In practice, however, authentic being appears to be more difficult of attainment at the religious level, when the religion concerned tends to impinge upon human autonomy at numerous points and so frequently as to create tremours of 'ontological dissonance'—hidden and unspoken tensions between the believer's inner depths and the directives of his infallible external Authority. However, in theory, as distinct from practice, the autonomous philosopher can not claim any superiority of status over the religious person who freely and authentically submits to an external Authority, provided their degree of authenticity be the same. This measurement is however almost impossible.

The outcome of the above analysis is that the method of epoche is pre-eminently desirable, both philosophically and religiously. Even if one loses one's traditional religious beliefs, this does not mean erosion of religion in the higher sense and of spirituality as such. It is all to the good if the individual becomes aware of his hidden assumptions and his heightened self knowledge or awareness of his existential depths which prompts him to choose one way or the other, thereby making him a fully integrated and mature human being out of a 'mass-man' or undifferentiated member of some human herd of class, no matter what it may be.

The Concept of an Interest-free Eeonomy

An interest-free society is, in theory, as possible as a society free from crime, divorce, fear or hatred. Yet, interest has continued to flourish in the human family despite its being banned by several religions. Is this state of affairs merely or primarily just another instance of the tension or the distance between the ideal and the real, or is it an instance of a contradiction at some other level? In other words, is there some specific socio-economic need which is effectively served by interest in defiance of its official or formal prohibition ?[9] If so, how will that need be served if an Islamic

Suspension of belief for the duration of the enquiry does not logically imply the rejection of the antecedent belief which might, possibly, even get confirmed as a result of the enquiry. If so, no problem of the conflict between faith and reason would arise. If, however, the verdict of the post-epoche reflection conflicts with one's faith, the individual remains free to make a well considered choice. If the person chooses the verdict of faith after the epoche he would not be inclined to 'rationalize' (in the perjurative sense) his choice. He would tend to justify his choice on the ground that this choice gives him a 'total satisfaction' which he values more highly than mere 'rational satisfaction'. And this would be a very valid stand to take, provided, of course, his sense of 'total satisfaction' is not tainted with or a disguised form of fear of some power, wordly, spiritual or Divine. There is nothing intrinsically objectionable in opting for faith rather than reason after passing through the discipline of the epoche. Likewise, there is nothing wrong if the person chooses the verdict of his free enquiry after passing through a struggle between the pull of faith and the pull of a total conviction of which 'rational satisfaction' is one of the components. And there can be no objection to this position also, provided the final choice of the individual is the fruit of his freedom rather than of fear, greed, or some situational constraint that frustrates self-discovery.

The fear of loss of traditional faith should not stand in the way of the person's quest for authentic being—his inner journey to reach 'the truth of his being' rather than 'the truth of his milieu'. Even if the believer loses his traditional faith or rather its traditional interpretation, this is not necessarily to lose his valuational roots or his spiritual identity, unlesss, of course, his free enquiry bring about a total repudiation and rejection of his initial thought and value systems. Should such a total repudiation occur, a person who is really honest to himself would have passed through a profound inner struggle And this experience would have forged all the more passionately the pure gold of human authenticity in the crucible of spiritual unrest and suffering.

In the final analysis, authenticity or authentic being, irrespective of its contents, is the highest possible mode of human existence, or

concept or practice including usury/interest. I submit even a committed Muslim economist *qua* social scientist, should do the same instead of assuming that interest is the root economic evil.

If I, as a Muslim, am inwardly convinced that interest must be evil, since the Quran prohibits it, and I do not suspend this belief while rationally examining the issue, as a student of ethics or economics my judgement would not be impartial but rather 'weighted' against interest. Even when I consciously aim to find out the truth rather than to defend any particular view, my perception of the function and utility of interest would be coloured by my antecedent beliefs. Likewise, if I have been conditioned by my milieu to hold all religion or pre-modern ideas as infantile myths and superstitions, I may miss out some crucially relevant consideration or aspect of the problems. Suspension of belief is indispensable for a detached and balanced approach. To the extent I fail I shall become selective—noting and emphasising some features and missing or ignoring others, thereby confirming my initial slant.[6] However, if I could empty or neutralize my ideological affiliations and predilections or 'ideological vested interests' as it were (as far as humanly possible), I would maximize the clarity of my vision for grasping the complex contours of the territory under investigation.

I am not claiming or suggesting that the social scientist ought to or possibly can do away with assumptions about human nature or with moral values. I am also not suggesting that the committed Muslim should lightly treat the Quranic prohibition against usury. The methodology, I am suggesting, is that while analysing and appraising economic concepts and practices, the social scientist must suspend or put in 'brackets' (in Husserl's sense of 'opoche') all one's preconceived notions and endeavour to discover and describe observable events with their correlations and also one's own authentic value judgments.[7] If he does not follow this approach, he most probably, would be advancing bad reasons for justifying what he takes to be the one and only one right interpretation of Scripture. When this happens, all theoretical argumentation with all the imposing methodological tools of social science—figures, charts, graphs, questionnaires etc.—would have gone waste. This danger is common to all utopian or ideological rationalizations.[8]

the Islamic state) was a medieval Iranian practice going back to the Jews in antiquity.

Sovereign Muslim rulers (Sultans) in Central Asia, India and elsewhere felt still more free to adjust and adapt the flexible economic and political culture of early and late early Islam to suit local and ever changing conditions. As and when the orthodox *ulema* tried to arrest this practice, tension and conflict developed between the king and the priest or the state and the church. With a few exceptions, the Indian Muslim kings (even much before the radical and liberal Akbar) asserted the supremacy of the state in wordly matters and consistently refused to treat the opinions and advice of the *ulema* in such matters as binding upon the state.

The so-called Islamic economic/agrarian system cannot, therefore, be given the same sanctity and binding power as the Islamic precept system relating to prayers, fasting etc. or laws relating to marriage, divorce and inheritance found in the Quran.

Economic systems are neither Islamic nor un-Islamic, so long as they do not violate any Quranic imperatives concerning *riba* and *zakat*. There can be, I submit, no Islamic truths of economics any more than there could be Islamic laws of Astronomy, Physics, Chemistry, Biology, or Medicine.[5] Economics must be treated as an empirical social science governed by the standard scientific method appropriate to its nature, scope and limits. As a science all theories, conceptual models, mathematical projections and predictions of mass behaviour, and socio-economic implications of fiscal policies will have to be empirically tested for their validity or truth. All pre-conceived notions, assumptions, untested hypotheses, will hamper the economist's task of analysing the motives, structure and implications of general economic behaviour.

The above task implies a neutral phenomenological analysis of economic concepts, practices and systems (just as a natural scientist analyses natural phenomena) rather than the justification of any pre-rational conviction concerning any particular economic

Sunnat alone without recourse to pure economic thinking and socio-ethical reflection. In the final analysis, therefore, the term 'Islamic Economics' tends to mislead us into seeking and projecting 'Islamic truths' of economics, or saying that Islam demands the true Muslim to accept this or that economic system as pre-condition of professing 'true' Islam. However, 'Islamic economics' in the purely descriptive sense (both historical and geographical) remains valid. Due to semantic confusions several Islamic social scientists, writers and statesmen now find themselves disputing not only with 'secular' economists but among themselves about the identity of the true Islamic system of economics.[4] Paradoxically, the Islamic system which was assumed to be Divinely imposed and an infallible standard for judging man-made system of thought, itself becomes a matter of unending debate. One, therefore, cannot help concluding that the directive thrust of the Quran lies in spiritual beliefs and moral exhortation rather than in the sphere of economic legislation. Anyone who claims that the Quran prescribes any particular economic philosophy or system is as off the mark as one who claims that the Quran supports or affirms any particular theory of Astronomy, Physics or Biology. No system could possibly claim a Quranic mandate such as possessed by the laws of inheritance, divorce, prohibited degrees of marriage etc. which are specifically contained in the Quran. No positive economic system of Islam could be anything more than a rough logical construction based upon two or three economic injunctions viewed as axioms by the believer. The Islamic system of piety and liturgy, falls in a unique category, since its contours and details were structured by the Prophet himself on the basis of abstract Quranic injunctions.

What is being called 'the Islamic economic/agrarian system' was a slow growth which took place in only a marginal sense in the lifetime of the Prophet, who acquired full and effective control of the peninsula only a year before his death. The real contours of the system took shape under Caliph Umar, and the evolution continued for centuries.

The nascent Islamic economic system freely borrowed (quite understandably) from the economic culture of pre-Islamic space-time. Thus, *jizya*, (the tax on protected non-Muslim citizens of

to the task of prescribing economic policy on the basis of conceptual analysis. According to this theoretical approach, the socio-economic environment or polity of a truly Muslim state m reflect and promote the basic Islamic conception of the good life in all its multifarious aspects. However, as soon as we try to spell out the concrete socio-economic features demanded by 'Islamic Economics', we find ourselves faced with conflicting possibilities of choice. And we are thrown back upon common sense, economic theory and actual experience in order to clinch various issues.

This difficulty arises because Islamic values—equality, fraternity, generosity, charity, sympathy, justice, compassion and so on—are all abstract concepts. The moment we try to realize them in the framework of laws and a concrete polity, a plurality of socio-economic blue-prints become candidates for the title 'Islamic' on the ground of best serving the values of Islam. The same difficulty (to a lesser degree) arises in connection with the two or three specific Quranic economic injunctions mentioned previously also in the case of the expression 'Islamic economic system'.

If we take the expression 'Islamic economic system' to mean a normative system which, as an essential part of the Islamic faith, is permanently binding upon all good Muslims, no such system is found in the Quran or the *Sunnat*. Nor can any such system possibly be deduced (logically) or inferred (analytically or analogically) from the Quran and the *Sunnat*. The actual claim by a person, that a particular system is the Islamic norm, is nothing more than the expression of his opinion—possibly very learned and worthy of consideration. To put it in other words, all such claims are essentially recommendations made by some person that his proposed system be accepted as the Islamic norm in the light of what he believes the ultimate Authority would have approved of at the present moment of time. It should be evident that different recommendations reflecting different preferences and views would be made.

Thus, we find that 'Islamic Economics' in the sense of prescriptive economic theory lands Muslims into controversies which, by their very nature, cannot be solved on the basis of the Quran or the

history. At the same time it has been disapproved of in Judaism and Christianty.[3] The explanation is two-fold. First, it meant unearned gains for the lender who did not sweat and toil, but, just reaped the advantage of money power; second, (and this is crucially important) the excess demanded by the lender tended to be much too high for the borrower's capacity to pay without great hardship. The demand of compound interest made the situation infinitely worse. On the top of this, the contractual penalty for failure to return the sum due was bonded labour for the borrower for as long as three to seven years. The concept and practice of usury in the ancient and middle ages was, in other worlds, closely tied up with the institution of bonded labour—a form of temporary slavery entered into by mutual contract between the lender and the borrower. This aspect of usury was morally most repugnant in the case of distress loans.

The Jewish moral sensibility and group concern or solidarity led them strongly to disapprove of usury among themselves, though charging usury from non-Jews was permissible. The condemnation of usury in Judaism and its indirect approval by Aristotle (who held that since money did not breed, seeking its increment through interest was unnatural) shaped the ancient and medieval Christian approach, though the New Testament is silent on this issue. The Quran also strongly prohibits usury, and both Christainity and Islam make the prohibition applicable to all human beings. Assuming usury to be wrong, in principle, its universal prohibition by Christianity and Islam is desirable and an advance upon the Jewish ethos.

The Proper Approach to Economics

Does the expression 'Islamic Economics' have any significance apart from economic history or economic geography of the Muslim world, or the contribution of Muslim social scientists to Economics? It might be thought that 'Islamic Economics' is also a theoretical social science whose subject matter is the best method of material wealth within the parameters. In this sense the scope of 'Islamic Economics' wouldgo beyond the mere description of what is the case

regard to 'interest', the exact meaning of the Arabic term *riba* used in the Quran should be determined, instead of mechanically or blindly equating it with the English word 'interest'. At times words of a living language retain their old spelling and grammar but their functional meaning and practical significance change radically due to various factors. Hence, there is all the more need for caution in this context. The advocates of literal obedience to the Quran also ignore (rather much too readily) the historical fact that the Prophet and the pious Caliphs always resorted to juristic reflection or interpretation of the Quranic text. This naturally led to the admission of qualifications, subtle distinctions in the understanding of the operative or directive meaning of the plain literal texts. For instance, the seemingly categorical Quranic injunction that the hands of the thief be cut off was never applied unconditionally on pain of disobeying the word of God.[3]

It follows that full investigation into the socio-economic conditions of the then Arab society and the present conditions, plus mature reflection on or interpretation of the Quranic text (rather than simplistic literal obedience to the Quran or the Prophet) is the correct approach, not only for secular social scientists but also for the committed Muslim drawing inspiration from the Quran and the example of the Prophet.

The Arabic word *riba*, literally means increase or growth of any thing or entity—physical, biological or spiritual. Thus the Quran refers to *riba* with respect to phenomena like spiritual merit *Sawab* or punishment. In the economic sphere *riba* means the excess expected and demanded by the lender from the borrower over and above the principal amount lent. Prima facie, the demand is similar, if not identical, with the demand for rent or lease, or consideration for some service rendered or temporary transfer of some right or enjoyment. The value of say, Rs. 10,000 as a lump sum at any one point of time, is arithmetically identical with the same amount spread over several years. Yet a consolidated sum has power to purchase an animal, land or tools which, in turn, augment the wealth of the user, while the same sum spread over a long period of time lacks this purchasing power. *Riba* or usury has thus, understandably, been a universal practice in recorded

regulations prescribed in the Quran are the verses dealing with *zakat* (tax on surplus wealth) and *riba* (usury/interest).

The verses are as follows :

"Establish worship, pay the poor-due, and bow your heads with those who bow (in worship)." 2 : 43.

"Those who swallow usury cannot rise up save as he ariseth whom the devil hath/prostrated by (his) touch. That is because they say : Trade is just like usury ; whereas Allah permitteth trading and forbiddeth usury. He unto whom an admonition from his Lord cometh and (he) refraineth (in obedience thereto), he shall keep (the profits of) that which is past and his affair (henceforth) is with Allah. As for him who returneth (to usury)—such are rightful owners of the Fire. They will abide therein". 2 : 275.

"O yo who believe ! Devour not usury, doubling and quadrupling (the sum lent). Observe your duty to Allah, that ye may be successful." 3 : 130.

"And of their taking usury when they were forbidden it, and of their devouring people's wealth by false pretences : We have prepared for those of them who disbelieve a painful doom." 4 : 161.

"That which ye give in usury in order that it may increase on (other) people's property hath no increase with Allah ; but that which ye give in charity, seeking Allah's countenance, hath increase manifold." 30 : 39.

The above English translation of the Quranic verses is from Pickthall's famous 'The Meaning of the Glorious Koran'.

The Quran nowhere gives any further details, as it does in the case of some other matters—inheritance, divorce, remarriage, evidence and even the proper procedure of oaths.

It may be thought that since the Quran prohibits usury/interest and implicit obedience to the Quran—the infallible word of God—is obligatory on the believer, there is no option for him except totally to abjure interest. This line of thinking ignores the methodological principle that prior to drawing any conclusion with

charging of interest on bank loans for industrial commercial purposes have been totally banned since early 1985, though the ban does not yet apply to foreign transactions. A new scheme of Islamic profit/loss sharing by bank depositors has recently been started for promoting investment and economic growth without the lever of interest. It is expected that these innovations would not adversely affect the rate of growth or health of the economy. On the other hand, the abolition of interest is expected to promote social justice and general welfare and to remove several social or moral evils inseparable from various non-Islamic politics.

Whatever be the truth of the above claims, the fact is that no attempt has been made, to my knowledge, to present a historical and systematic theoretical analysis of interest or an integrated theory of general economics to show how a totally interest-free world economy would or could work in an admittedly imperfect and imperfectible world.

In what follows I shall first analyse the basic concept of an Islamic economic system, as an integral part of the Islamic faith. I shall then examine the basic thesis that the abolition of interest is the root remedy for man's socio-economic ills.

Quranic Texts Dealing with Economic Matters

Quranic verses dealing with fiscal or economic matters are, with literally two or three exceptions, in the nature of moral exhortations to do the right or the customary and not specific injunctions implying or even pointing to any 'economic system'. Thus, for instance, Quranic verses repeatedly enjoin believers to spend in the way of God, to help the needy, the traveller and the orphan, to avoid extravagance, pomp, avarice and the hoarding of wealth, to be just in weighing and measuring, to fulfil promises and contracts, to avoid bribery and cheating, to be lenient to the debtor, to give honest testimony even when it goes against one's kin, and so on.

It will be seen that all the above verses are ethical maxims rather than economic rules or regulations. The only economic

INTRODUCTION

The Islamic Resurgence movement has led to a call for Islamizing society and polity in several Muslim states. The declared rationale for this call is the view set forth by several Islamic intellectuals, theologians and statesmen that Islam is not merely a system of individual devotion and piety calculated to bring about spiritual salvation in life hereafter, but rather a complete way of life, a blue print of the good life in its totality including politics and economics. The concrete contours and details of this map, so they say, ought to be adjusted with the concurrence of competent *ulema* in view of the ever changing human situation. Nevertheless the total map must be firmly based upon the Quran and the example of the Prophet.

The advocates of Islamic Resurgence hold that the Muslim liberals of the last and mid-twentieth centuries merely blindly imitated Christain liberalism which viewed religion merely as a personal relationship between man and God without regulating human political and economic concerns The advocates of Islamization hold that Liberalism, Socialism and Communism have all failed to cure man's life in the modern age and that the only hope for mankind lies in a return to the Islamic or Quranic system of economics and politics[1].

In the sphere of economics, the main thrust of the Islamic Resurgence movement is the literal implementation of the Quranic prohibition of usury/interest which is seen to be the root evil. It is claimed that *zakat* (the Islamic wealth tax) and the Quranic law of inheritance would suffice in an interest-free society to cure all economic problems *Zakat*, as a $2\frac{1}{2}\%$ tax on net wealth at the end of the financial year, was made a statutory tax about five years ago in Pakistan and is being regularly collected by the state directly from banks in the case of all *Sunni* Muslims who are the dominant majority in Pakistan. Payment of bank interest on deposits and

DR. JAMAL KHWAJA (b. 1926): Took his education at Allahabad, Aligarh and Cambridge. In Cambridge his specialised field of study was contemporary western thought under the guidance of world-reputed philosophers namely Broad, Wisdom & Ramsey Appointed as lecturer of Philosophy in the Aligarh Muslim University in 1953, he was elected to the Lok Sabha in 1956 and actively participated in the Indian politics upto 1962. Presently he is a Professor of Pholosophy in Aligarh Muslim University, Aligarh.

His works include :

Five Approaches to Philosophy (1965), Quest for Islam (1977) and Authenticity and Islamic Liberalism (1987).

Khuda Bakhsh Extension Lectures, 1986

The Concept of
The Islamic Economic System

by

Prof. Jamal Khwaja

CONTENTS

The concept of Islamic Economic System	Prof.Jamal Khwaja	1-
Urdu Section		
Letters of Rashid Siddiqi to Prof. Masood Husain	Prof.Masood Husain	1
Hyderabad Urdu Dictionary	Mr.Hasanuddin Ahmad	3
Yunus Amrah: The first Sufi poet of Turkey	Dr.Erkan Turkmen	3
A Rare Treatise on Jantri	Mr.S.S.Md.Ismail	3
Review		
Urdu International (Canada)	Editor	3
Iqbaliyat/Iqbal Review (Lahore)	,,	3

Printers : Liberty Art Press, New Delhi and Patna Litho Press, Patna.
Publisher : Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 501
Editor : Dr. A. R. Bedar
Annual subscription : Rs100-00 (Inland), 20-00 Dollars (Asian countri
40 Dollars (other countries)Rs. 25-00 per copy.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



46

Khuda Bakhsh Library
Acc. No. S2224

1988

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA-800004
(INDIA)

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



46

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

PATNA